www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

November-December 2024 • Rs. 40

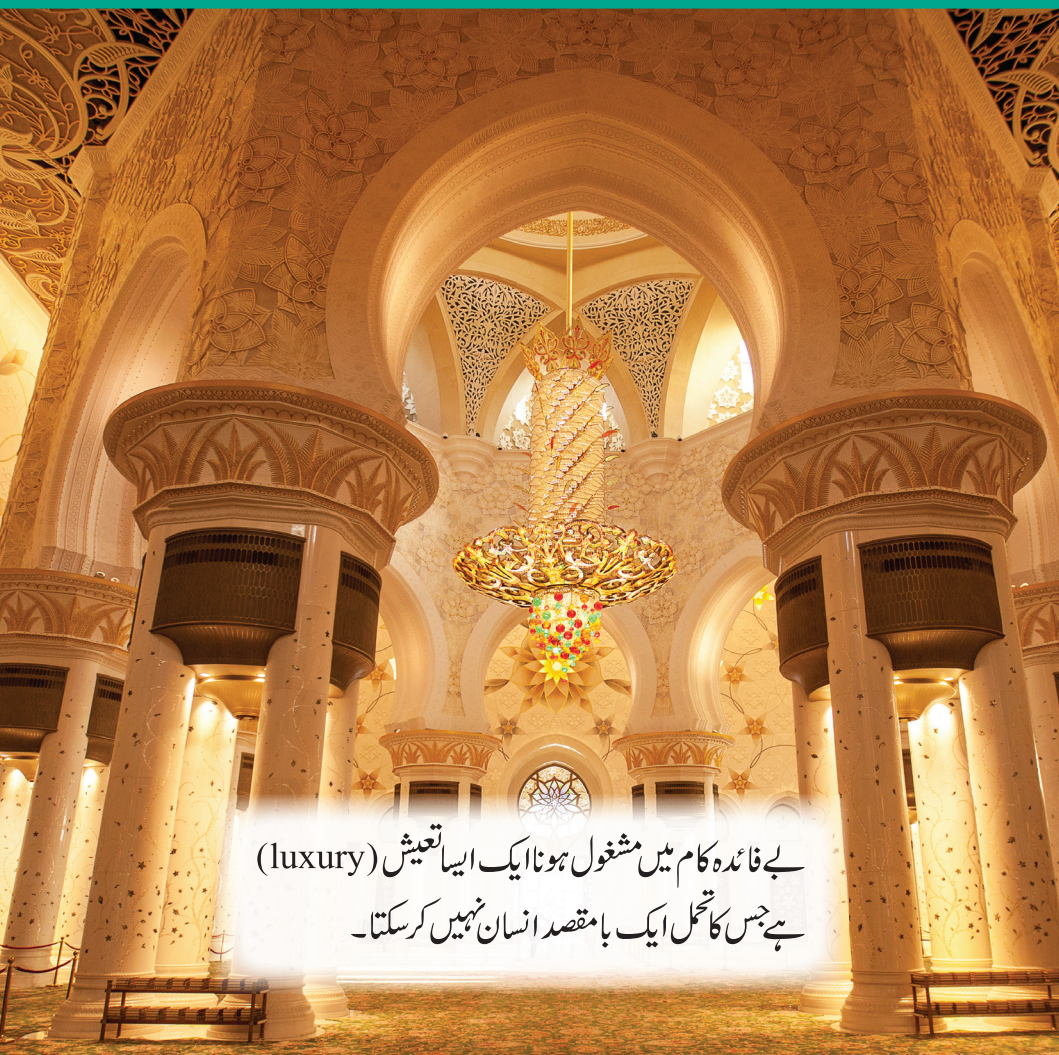

بے فائدہ کام میں مشغول ہونا ایک ایسا تعیش (luxury) ہے جس کا تحمل ایک بامقصد انسان نہیں کرسکتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Nov-Dec 2024 | Volume 49 | Issue 6

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

نیا سال: امید و احتساب	4	گفتگو کا انداز	20
بے صبری نہیں	6	وعظ کون کرے	21
انسان کا مزاج	7	فرقان کا اصول	22
اعترافِ خطا	8	استقامت کی صفت	23
دو قسم کے انسان	9	غلطی کا اعتراف	24
غیر سنجیدہ انسان	10	کنفیوزن کیوں	25
خدا کا وجود	11	بیانیہ انداز	26
یونیورسل فیکٹری	12	خوشی کیا ہے	27
یہود کا ذکر قرآن میں	13	بے اطمینانی کا سبب	28
مایوسی نہیں،		موت کا سفر	29
ری پلاننگ	14	مطالعۂ حدیث	30
خدا کی آواز	15	دین میں آسانی	34
غصہ ایک طاقت	16	ڈائری 1986	36
اعتصام باللہ ہدایت		ایک انٹرویو	40
کا ذریعہ	17	آئیڈیل وزڈم،	
اسلامی روحانیت	18	پریکٹکل وزڈم	47
ظلم یا عصری تقاضا	19	قارئین الرسالہ	48

مقام کیسے ملا؟	1
بولنے کا طریقہ	3
بولنے کی سوجھ بوجھ	4
زبان اور دل سب سے اچھے بھی ہے اور سب سے خراب بھی	5
غیر-خونی انقلاب	6
میعار کو بلند کرنا	8
ایک حدیث	10
بولنے والا نبی	11
مشکل میں آسانی	12
اللہ کی یاد تمام اعمال کا خلاصہ ہے	15
لائق اور صالح آدمی	
ہر چیز سے زیادہ قیمتی	16
کمانے والا اپنے کو بڑا نہ سمجھے	16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

نیا سال: امید و احتساب

ہر غروب کے لیے ایک نیا طلوع مقدر ہے

سورج پچھّم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی "غروب" آخری نہیں۔ ہر غروب کے لیے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر امید اور حوصلہ باقی ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ مثبت سوچ کے ساتھ ازسرِنو اپنی جد و جہد کا منصوبہ بنائے، اور زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔

احتساب

19 جنوری 1989 میں کشمیر کے دو صاحبان ملاقات کے لیے آئے۔ ان سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے جن لوگوں کو اپنا لیڈر بنایا، وہ سب کے سب مقرر تھے، ان میں کوئی بھی شخص مدبر نہ تھا۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر طرف ناکام اور برباد نظر آتے ہیں۔ قوموں کی رہنمائی کے لیے مدبر شخص چاہیے، مقرر شخص کبھی قوم کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔

اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے میدان میں تلاش کرنے کے بجائے سیاست کے میدان میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے، اپنے مسائل کے حل کے لیے دوسروں کے خلاف مہم چلانا۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لیے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگ ایمان اور اخلاق کے

اعتبار سے مضبوط ہوں، وہ تعلیمی اعتبار سے آگے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو، اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو پہچانیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر یہ شعور ابھارا جائے کہ وہ اعلیٰ سوچ والے انسان بنیں۔ انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی ترقی کا دارومدار ہے۔ لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لیے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہو سکے تو اب انھوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لیے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے وہ، قرآن کے مطابق، صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے کلمہ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمہ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمہ طیبہ کے درخت کے لیے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا: أَصْلُها ثابِتٌ وَفَرْعُها فِي السَّماءِ (14:24)۔ یعنی، کلمہ طیبہ کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس، اللہ تعالی کے قانونِ فطرت کے مطابق، یہ انجام صرف کلمہ خبیثہ کے درخت کے لیے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ قرآن کے الفاظ میں، کلمہ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہیں: اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَها مِنْ قَرَار (14:26)۔

صورِ آخرت

یکم جنوری 2002 کو میں بمبئی (موجودہ ممبئی) میں تھا۔ میں ہارون شیخ صاحب کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ 12 بج کر ایک منٹ پر گولا داغنے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ نیا سال شروع ہو گیا ہے — اسی طرح ایک وقت آئے گا جب کہ صور پھونکا جائے گا۔ صور کی آواز اس بات کا اعلان ہوگی کہ انسان کے لیے ایک دورِ حیات ختم ہو گیا اور اب اس کی زندگی کا اگلا دورِ حیات شروع ہوا ہے جس کو آخرت کہا جاتا ہے۔

بے صبری نہیں

ایک حدیثِ رسول یہ ہے: الأَنَاۃُ مِنَ اللّٰہِ وَالعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطَانِ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 2012)۔ یعنی عدم عجلت اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔ ایک دوسری روایت میں ہے: وَإِذَا اسْتَعْجَلْتَ أَخْطَأْتَ، أَوْ كِدْتَ تُخْطِئُ (السنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر 20271)۔ یعنی، اگر تم نے جلد بازی کی تو غلطی کا ارتکاب کیا، یا یہ امکان ہے کہ تم غلطی کر جاؤ۔

انسانی عمل کے دو طریقے ہیں — ایک ہے عجلت کا انداز، اور دوسرا ہے توقف کا انداز۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جو کام سوچ سمجھ کر کیا جائے، اس میں نقصان کا اندیشہ کم رہتا ہے۔ اس کے برعکس، جس کام کو بغیر سوچے سمجھے اور منصوبہ بندی کے بغیر کیا جائے اس میں نقصان کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ اس فطری حقیقت کا اعلان ٹریفک سیفٹی کے حوالے سے شاہراہوں پر جگہ جگہ کیا جاتا ہے — تیز رفتاری سے انسان کو تھرل ملتا ہے، مگر وہ انسان کی جان لے لیتا ہے:

Speed thrills but kills

گاڑی چلاتے ہوئے راستہ میں بہت ساری چیزوں کی رعایت کرنی پڑتی ہے تب آپ حفاظت کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً اسپیڈ بریکر، ٹریفک لائٹ، دوسری گاڑیاں، پیدل چلنے والے لوگ اور سڑک کا گڑھا (pothole)، وغیرہ۔ اگر آپ ان چیزوں کا خیال نہ کریں، اور فل اسپیڈ میں گاڑی کو چلاتے رہیں تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ کسی جگہ آپ ایکسیڈنٹ سے دوچار ہو جائیں گے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بقول "اس دنیا میں ہر کام خارجی اسباب کی رعایت سے انجام پاتا ہے۔ آپ کی زندگی میں 99 فی صد سے زیادہ حصہ خارجی اسباب کا ہے اور ایک فی صد سے بھی کم حصہ اپنی کوشش کا۔ خارجی اسباب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے جو اقدام کیا جائے گا وہ صرف تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ جلد بازی میں آدمی صرف اپنی خواہش کو جانتا ہے، وہ خارجی اسباب سے بے خبر رہتا ہے۔ اس کے برعکس، صابر انسان اپنی خواہش کے ساتھ خارجی اسباب کو بھی اپنے دھیان میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد بازی کرنے والا آدمی اکثر ناکام ہوتا ہے اور صابر انسان ہمیشہ کامیاب رہتا ہے" (ماخوذ، الرسالہ، مارچ اپریل، 2022)۔ ڈاکٹر فریدہ خانم

انسان کا مزاج

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ (41:49)۔ یعنی، انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا، اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔

انسان کی ایک صفت عدم اطمینان (discontent) ہے۔ یہ صفت فطری طور پر ہر انسان کے اندر ہوتی ہے۔ یہ اصلاً ایک مثبت صفت ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ آدمی ہمیشہ کوشش کرتا رہے۔ وہ زندگی میں کبھی کوشش کے عمل کو نہ چھوڑے۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے مطلوب کو اپنے نشانے سے کم پاتا ہے۔ یہ واقعہ انسان کو مایوسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر آدمی یہ کرے کہ وہ ملے ہوئے کا اعتراف کرے، اور نہ ملے ہوئے کے لیے ری پلاننگ کرتا رہے، تو اس کے اندر شکر کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ وہ مایوسی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ضائع کرنے سے بچ جائے گا، ناممکن کی تلاش میں وہ ممکن سے محروم نہیں رہے گا۔

آدمی کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب بھی وہ اپنے مقرر نشانے کو نہ پائے، وہ محسوس کرے کہ اس کا مطلوب اس کو حاصل نہیں ہوا تو وہ منفی سوچ کا شکار ہونے کے بجائے ری تھنکنگ (rethinking) کا طریقہ اختیار کرے، وہ پورے معاملے کا ازسرنو جائزہ لے۔ وہ دریافت کرے کہ انسان کے لیے اللہ کا منصوبہ تخلیق کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس غور و فکر میں وہ اپنی زندگی کی کچھ گم شدہ کڑی (missing link) کو دریافت کر لے، جس سے بے خبر ہونے کی بنا پر وہ مایوسی کا شکار ہو گیا تھا۔

یہی وہ حقیقت ہے، جس کو صلح حدیبیہ کے حوالے سے ایک تابعی نے ان الفاظ میں نقل کیا: فَمَا فُتِحَ فِي الْإِسْلَامِ فَتْحٌ قَبْلَهُ كَانَ أَعْظَمَ مِنْهُ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 322)۔ یعنی اسلام میں اس سے پہلے جو فتح حاصل ہوئی، ان میں سے کوئی فتح اتنی عظیم نہیں ہے — انسان کی ہر منفی سوچ مواقع سے بے خبری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آپ اپنی بے خبری کو توڑیے، اور آپ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوں گے۔

اعترافِ خطا

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (39:53)۔یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

یہ آیت تخلیقی (creative) مزاج لوگوں کے بارے میں ہے۔ تاریخ میں تمام بڑا کام تخلیقی مزاج لوگوں نے کیا ہے۔ وہ عام لوگوں سے زیادہ بڑا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ روایتی طریقے سے ہٹ کر کام کرتے ہیں۔ اس بنا پر ایسے لوگوں کے لیے غلطی کا امکان بھی زیادہ رہتا ہے۔ آیت میں اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ آدمی ہر حال میں پُرامید رہ کر اپنا عمل جاری رکھے۔ وہ ہر حال میں یہ ایمان رکھے کہ اگر نیت درست ہے تو کوئی غلطی خواہ کتنی ہی بڑی ہو، اللہ کی معافی کی کوئی حد نہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ مجھ سے برابر گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے کہا: جب بھی غلطی ہو جائے توبہ کرلو، اس نے کہا: تب میرے گناہ بہت زیادہ ہو جائیں گے۔ آپ نے کہا: عَفْوُ اللّٰهِ أَكْثَرُ مِنْ ذُنُوبِكَ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 4854)۔یعنی، اللہ کی معافی تیرے گناہ سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلطی کرنا برائی نہیں ہے، بلکہ غلطی کرنے کے بعد اللہ سے رجوع نہ کرنا برائی ہے۔ اللہ کے بارے میں یہ اعتقاد امید کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس عقیدہ کی صورت میں امید کی کوئی حد نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان ایک ارتقا پذیر حقیقت ہے۔ اس لیے اللہ کی رحمت سے امید کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل کا موقع انسان کے لیے ہر حال میں باقی ہے۔ یہ عقیدہ گویا مزید عمل کے لیے محرک (incentive) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کے اندر عمل کے مواقع کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ مزید سوچے، اپنا کریکشن کرے اور مواقع کی مزید صورتیں ڈھونڈ کر نکالے اور ہر حال میں اپنے مقصد کے لیے کوشش جاری رکھے۔ اس دنیا کا فطری قانون یہ ہے کہ جو نا امید ہوا، وہ ناکام ہو گیا، اور جس نے امید باقی رکھی، وہ کامیابی تک پہنچا۔

دو قسم کے انسان

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ انسان جو بہت بولتا ہے، لیکن کام میں وہ پیچھے ہوتا ہے۔ اور دوسرا انسان وہ ہے، جو بقدرِ ضرورت بولتا ہے۔ ورنہ چپ رہتا ہے۔ پہلا انسان وہ ہے، جو بولتا زیادہ ہے، لیکن سوچتا کم ہے۔ اور دوسرا انسان وہ ہے، جو سوچتا زیادہ ہے، اور بات کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ پہلے قسم کے انسان کا دوسرا نام ہے غیر سنجیدہ انسان، اور دوسرے قسم کے انسان کا نام ہے سنجیدہ انسان۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ جو انسان زیادہ بولے گا، وہ کرنے کے معاملے میں کم ہوگا۔ اس کے برعکس، جو آدمی کم بولے گا، وہ کرنے کے معاملے میں زیادہ ہوگا۔ عقل مند آدمی وہ ہے، جو کسی کے بولنے کو نہ دیکھے۔ بلکہ وہ یہ دیکھے کہ کوئی آدمی کرنے کے وقت کیسا کام کرتا ہے۔ قرآن میں دو آیتیں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (61:2-3)۔ یعنی اے ایمان والو، تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضگی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرو نہیں۔

مفسر ابن کثیر ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ ان لوگوں پر تنقید ہے، جو کہتے ہیں، لیکن کرتے نہیں، وعدہ کرتے ہیں، لیکن اس کو پورا نہیں کرتے (إِنْكَارٌ عَلَى مَنْ يَعِد عِدَةً، أَوْ يَقُولُ قَوْلًا لَا يَفِي بِهِ)۔ بعض علما نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا مطلقاً واجب ہے، خواہ جس سے وعدہ کیا ہے وہ اس کی تاکید کرے یا نہ کرے (تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 105)۔

حقیقی انسان وہ ہے، جس کے کہنے اور کرنے میں مطابقت ہو، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ آدمی کو اپنے کہنے کی قیمت دینی پڑے۔ جب ایک انسان کے اندر یہ صفت پیدا ہو جائے تو وہ بولنے سے پہلے بہت زیادہ سوچے گا۔ وہ کوئی ایسی بات بولنے سے بچے گا، جو وہ پورا نہ کرسکتا ہو۔ اس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایمان والے کو چاہیے کہ وہ خیر کی بات کرے یا چپ رہے (فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُت) صحیح البخاری، حدیث نمبر 6018۔

غیر سنجیدہ انسان

قرآن میں انسان کی ایک ناپسندیدہ روش کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (27:14)۔ یعنی اور انھوں نے ان کا انکار کیا، ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے، حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا۔

انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو حق کی دلیل واضح ہوجانے کے بعد بھی اس کو نہیں مانتے ہیں، وہ اپنے غیر سنجیدہ جواب کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حق کی بات اس قابل ہی نہیں کہ اس کو کوئی وزن دیا جائے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان دلیل سمجھ میں آجانے کے بعد بھی اس کو نہیں مانتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دلیل کو ماننا اپنی بڑائی کی نفی کرنا ہے، اور غیر سنجیدہ انسان کو یہ پسند نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنی بڑائی کی نفی کی قیمت پر کسی بات کو مانے۔

یہ روش درست روش نہیں۔ یہ مزاج تواضع (modesty) کے خلاف ہے۔ خواہ انسان اپنے آپ کو کتنا ہی زیادہ ماڈسٹ مانے۔ جس آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پائی جائے، اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ ہر چیز کو سچائی کی نسبت سے دیکھے گا، نہ کہ کوئی بات اس کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں۔ ماڈسٹ انسان اپنے مزاج کو بمقابلہ انسان کی نظر سے نہیں دیکھے گا، بلکہ وہ اپنے مزاج کو بمقابلہ سچائی کی نظر سے دیکھے گا۔

کوئی انسان غیر سنجیدہ انسان کیسے بنتا ہے۔ جب وہ زندگی کی گہری حقیقت سے واقف نہ ہو، وہ خدا کی معرفت سے خالی انسان ہو۔ ایسا انسان دنیا کو اس کے ظاہر کے اعتبار سے دیکھتا ہے، اور اسی اعتبار سے اپنے لیے ایک روش اختیار کرتا ہے۔ یہ طریقِ زندگی بلاشبہ خدا سے بے خوفی کا نتیجہ ہے۔ اس کے برعکس، سنجیدہ انسان وہ انسان ہے، جس کو سچائی کی دریافت ہو، اس کی زندگی کا مقصد خدا کی معرفت حاصل کرنا ہو۔ وہ تدبر و تفکر کا طریقہ اختیار کرے، تاکہ اس کے ذریعے سے اس کو کوئی روحانی خوراک حاصل ہو (آل عمران، 3:190-194)۔

خدا کا وجود

خدا کی دریافت انسان کے لیے معرفت کا آغاز ہے۔ جو شخص اللہ رب العالمین کو دریافت کر لے اس نے تمام حقیقتوں کو دریافت کرلیا۔ اس نے حقیقت کے سرے کو پالیا۔ خدا کی دریافت کے بغیر ہر چیز غیر دریافت شدہ بنی رہتی ہے۔ خدا کی دریافت کرنے کے بعد ہر چیز دریافت شدہ بن جاتی ہے۔ خدا کو دریافت کرتے ہی انسان کو وہ شاہ کلید (master key) مل جاتی ہے، جس کے بعد اس کے لیے ہر چیز کو دریافت کرنا ممکن ہوجاتا ہے۔ خدا کو دریافت کرتے ہی اس کے ذہن کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی دروازہ اس پر بند نہیں رہتا۔

خدا کی دریافت کسی انسان کے لیے اتنا ہی آسان ہے، جتنا خود اپنی دریافت۔ اسی لیے کہا گیا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (حلیۃ الاولیاء، جلد 10، صفحہ 208)۔ یعنی جس نے اپنے آپ کو دریافت کیا، اس نے اپنے خدا کو دریافت کرلیا۔ اس قول کو ایک حدیث پر غور کرکے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِه (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6227)۔ یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کے اندر جو صفات خالق کی سطح پر کامل معنوں میں موجود ہیں، انھیں میں سے کچھ صفات انسان کے اندر مخلوق کی سطح پر بطور عطیہ موجودہ ہیں، جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ مثلاً رحم، شفقت، تدبیر، وغیرہ۔ اس کی بنا پر یہ ممکن ہے کہ آدمی ایک سے دوسرے کو سمجھے۔ وہ اپنے وجود کی معرفت حاصل کرکے اللہ رب العالمین کی معرفت تک پہنچے۔ اگر آدمی ایسا کرے تو اس کے لیے اللہ کی یاد، اللہ سے دعا کرنا، اللہ کا تصور قائم کرنا، آسان ہوجائے گا۔

مثلاً انسان اپنے ساتھ کسی کی شرکت کو پسند نہیں کرتا۔ اس کو غیرت آتی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی انسان اس کا شریک بن جائے۔ اس تجربے سے انسان کو یہ سبق لینا چاہیے کہ اللہ رب العالمین بدرجہا زیادہ اس صفت کا حامل ہوگا، یعنی اس معاملے میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ انسان اگر سنجیدہ ہو تو یہ اصول اس کے لیے خدا کی معرفت میں بہت زیادہ مددگار بن جائے گی۔

یونیورسل فیکٹری

برٹش شاعر والٹر (Walter de la Mare, 1873-1956) کا واقعہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ گھر کے کئی افراد کھانے پینے میں مشغول تھے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ شاعر نے دیکھا کہ وہ فوڈ آئٹم لیتی ہے، اور اس کو کھاتی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کھانا جو لڑکی کھا رہی ہے، وہ کھانا جسم میں پہنچ کر خون اور گوشت اور ہڈی کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے یہ شعر کہا:

It's a very odd thing, As odd as can be,
That whatever Miss T eats Turns into Miss T.

کھانا کھانے کے بعد انسان کے جسم میں کیسا حیرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے، یعنی کھانا اور پانی جسم کے اندر انسان کی شخصیت کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ خداوند رب العالمین کی ایک عجیب وغریب فیکٹری ہے، جس میں یہ واقعہ پیش آتا ہے۔

اس طرح کے تخلیقی واقعات اس زمین پر ہر لمحہ پیش آرہے ہیں۔ مگر یہ واقعات کسی اعلان کے بغیر پیش آتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دنیا ایک آٹو میٹک کارخانہ ہے۔ مگر کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ کائناتی کارخانہ آٹو میٹک نہیں ہے۔ یہ حی و قیوم رب العالمین کے حکم سے چل رہا ہے۔ فطرت کے اسی عظیم واقعے کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّماواتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَها ثُمَّ اسْتَوى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآياتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ (13:2)۔ یعنی، اللہ ہی ہے جس نے آسمان کو بلند کیا بغیر ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئیں۔ پھر وہ اپنے تخت پر متمکن ہوا اور اس نے سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند بنایا، ہر ایک، ایک مقررہ وقت پر چلتا ہے۔ اللہ ہی ہر کام کا انتظام کرتا ہے۔ وہ نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو۔

آدمی اگر ان نشانیوں میں غور کرے تو وہ کہہ اٹھے گا: فَتَبارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخالِقِينَ (23:14)۔ یعنی بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔

یہود کا ذکر قرآن میں

یہود کا ذکر قرآن میں اصلاً خود یہود کے لیے نہیں ہے۔ قرآن میں یہود کا ذکر بطور مثال ہے۔ یہود کی مثال سے امت محمدی کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اس روش سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس حقیقت کا اشارہ قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (57:16)۔ یعنی کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔

یہ کسی امت کے دورِ زوال کی بات ہے، جو طولِ امد یعنی لمبا عرصہ گزرنے کے بعد فطرت کے قانون کے مطابق لازماً پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ ظاہرہ بعد کی نسلوں میں پیش آتا ہے، نہ کہ ابتدائی نسلوں میں۔ بعد کے دور میں یہ ہوتا ہے کہ امت کی ابتدائی نسل ختم ہو کر نئی نسل آجاتی ہے جن میں عمومی سطح پر ایمان شعوری دریافت کے بجائے ایک قومی کلچر بن جاتا ہے۔ ان میں آخرت کا زندہ احساس باقی نہیں رہتا۔ خشیتِ الٰہی کے بجائے "اللہ کی منتخب قوم" کا خود ساختہ تصور پیدا ہو جاتا ہے، وغیرہ۔

اس دورِ زوال کا تعلق صرف یہود سے نہیں ہے، بلکہ ہر اس گروہ سے ہے، جس پر طولِ امد کا تجربہ پیش آجائے۔ یعنی وہ چیز جس کو نفسیات کی اصطلاح میں ڈی جنریشن کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی گروہ لمبی مدت پیش آنے کے بعد ڈی جنریشن کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ اس عمل سے کلی طور پر بچنا شاید ممکن نہ ہو۔ البتہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کے اثر کو کم کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانے کے یہود میں جزئی طور پر یہ واقعہ پیش آیا ہے، اگرچہ وہ زیادہ تر سیکولر معنی میں ہے۔ قرآن امتِ یہود اور امتِ نصاریٰ کی مثال دے کر امت مسلمہ کو یہ رہنمائی دے رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی زوال یافتہ روش سے دور رکھیں۔

مایوسی نہیں، ری پلاننگ

قرآن میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

اس آیت کا مطلب صرف عدم قنوط نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں ری پلاننگ کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنھوں نے پہلے چانس کو کھو دیا، ان کے لیے اللہ کے یہاں دوسرا چانس موجود ہے۔ وہ ری پلاننگ کر کے خود کو دوبارہ کامیاب بنا سکتے ہیں۔ عدم قنوط ایک عقیدے کی بات ہے، لیکن ری پلاننگ کا مطلب نیا راہِ عمل اختیار کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر کچھ غلطی ہو گئی تو اس کی بنا پر خود کو ہمیشہ کے لیے ناکام نہ سمجھ لو، بلکہ ری پلاننگ کر کے خود کو دوبارہ کامیاب بنا سکتے ہو۔

ری پلاننگ کا مطلب ہے پچھلے منصوبے میں تجربات کا اضافہ کرنا، اور نئی معلومات کی روشنی میں ازسرنو اپنے عمل کا نقشہ بنانا۔ اس طریقِ کار کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ پہلے منصوبے میں جو مقصد حاصل نہ ہوا ہو، اس مقصد کو دوبارہ بہتر انداز میں منظم کر کے ازسرنو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اصل یہ ہے کہ انسان ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ حدیثِ رسول ہے: كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2499)۔ یعنی ہر انسان غلطی کرنے والا ہے، اور سب سے اچھا غلطی کرنے والا وہ ہے جو غلطی کے بعد توبہ کرے۔ یہ حدیث مذکورہ آیت کی شرح ہے۔ اس کا مطلب صرف زبانی طور پر لفظِ توبہ دہرانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ خود کو ناامیدی سے بچا کر اپنا محاسبہ کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انسان کے اندر صحیح سوچ جاگے گی۔ اس طرح وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اس کے اندر ایک نئی شخصیت ایمرج (emerge) کرے۔ وہ اپنے معاملے کی ری پلاننگ کرے گا، اور سچائی کے راستے پر ازسرنو چلنے لگے گا۔

خدا کی آواز

خدا نے قرآن اتارا اور اس میں یہ کہا ہے کہ لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)۔ یعنی، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔ آیت کا یہ حصہ بتاتا ہے کہ خدا کی پلاننگ کیا تھی۔ وہ پلاننگ یہ تھی کہ قرآن پر ایمان لانے والے لوگ اٹھیں، اور اللہ کی مدد سے اس کو پوری دنیا کے انسانوں تک پہنچا دیں۔ ایک طرف قرآن میں یہ اعلان تھا، اور دوسری طرف اللہ نے دنیا میں ایک نیا پراسس چلایا، جس کے نتیجے میں انٹرنیشنل کمیونی کیشن کا دور وجود میں آیا، جس کو اویل کر کے خدا کے منصوبے کو پورا کرنا تھا۔

اس درمیان بہت سے لوگ اٹھے جو وقت کی انٹرنیشنل زبان، انگلش جانتے تھے۔ لیکن ان تمام لوگوں نے انگریزی زبان کو دنیا کمانے یا لیڈری کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ دوسری طرف خدا کا منصوبہ انتظار میں رہا کہ کوئی اٹھے، اور اس کی تکمیل کے لیے سرگرم ہو جائے۔ مگر میرے علم کے مطابق، کوئی ایک مرد یا عورت نہیں تھے، جو اس خدائی منصوبہ کے لیے اٹھے۔ کچھ لوگ بظاہر اٹھے، لیکن وہ اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس قابل نہیں تھے کہ وہ مطلوب معیار پر اس کام کو انجام دے سکیں۔

چنانچہ انھوں نے جو کام کیا، وہ لوگوں کے درمیان پہنچ نہ سکا۔ کیوں کہ وہ وقت کی معیاری زبان میں نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالی نے اپنے کچھ بندوں کو اس کام کے لیے چنا۔ ان کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کی کہ وہ اس کام کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس طرح قرآن کا ترجمہ مطلوب درجے کی زبان میں تیار ہوا، اور پھر انھیں بندوں نے اس ترجمے کو عالمی سطح پر پھیلانے کی کوشش شروع کی۔ ان شاء اللہ، لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا کا مطلوب واقعہ پیش آنے تک کام جاری رہے گا۔

میں سوچتا ہوں تو مجھے تصور میں ایسا لگتا ہے کہ قیامت آ گئی ہے۔ اور فرشتے اعلان کر رہے ہیں کہ وہ لوگ اعلیٰ انعام کے لیے سامنے آئیں، جو اپنی بے بضاعتی کے باوجود دنیا کی زندگی میں اس مقصد کے لیے اٹھے کہ قرآن کو وقت کی انٹرنیشنل زبان میں ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ تاکہ کسی کے لیے اللہ پر حجت قائم کرنے کی گنجائش نہ ہو (النساء، 4:165)۔ کیوں کہ یہی وہ مطلوب کام ہے جس کو انجام دینے سے عالمی انذار کا عمل پورا ہوگا۔

غصہ ایک طاقت

قرآن میں غصے کے بارے میں یہ رہنمائی آئی ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (3:134)۔ یعنی وہ غصہ کو پی جانے والے ہیں، اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ آپ نے کہا: غصہ نہ کرو (لَا تَغْضَبْ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 6116۔

قرآن اور حدیث میں غصہ کے بارے میں جو تعلیم دی گئی ہے، وہ زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ لوگوں کی باتوں پر غصہ ہونے کے بجائے غصہ کو کنٹرول کرو۔ یہ تمھارے لیے روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ وہ یہ کہ غصہ بظاہر ایک منفی واقعہ ہے۔ مگر جب تم ایسا کروگے تو فطرت کے قانون کے مطابق، غصہ کی طاقت کنورٹ ہو کر پازیٹیو واقعہ بن جائے گا۔ اس طرح غصہ تمھارے لیے تمھاری روحانی ترقی کا ذریعہ بن جائے گا۔

جب تم غصے کو کنٹرول کروگے تو اس کے بعد تمھارے اندر فطری طور پر ایک پراسس جاری ہوگا، جو تمھارے لیے روحانی ترقی کا ذریعہ بن جائے گا۔ آدمی کو جب غصہ آتا ہے تو یہ انسان کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہوتا ہے۔ غصے کے وقت انسان کے اندر ایک زبردست انرجی خارج ہوتی ہے۔ اس کو اینگر انرجی (anger energy) کہہ سکتے ہیں۔ اس انرجی کو اگر پازیٹیو سائڈ میں کنورٹ نہ کیا جائے تو وہ تخریب کا ذریعہ بن جائے گی، لیکن اگر اس انرجی کو پازیٹیو سائڈ میں کنورٹ کر دیا جائے تو وہ انسان کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

انسان کے اندر یہ سب جو ہوتا ہے، وہ خود فطرت کے پراسس کے تحت انجام پاتا ہے۔ اس وقت فطرت کے قانون کے تحت انسان کے اندر ایک عمل جاری ہوتا ہے، جو اینگر انرجی کو انسان کے لیے تعمیر کی طاقت کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اس معاملے میں انسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ غصہ کے وقت چپ رہ کر فطرت کے قانون کو اپنا کام کرنے کا موقع دے۔

اعتصام باللہ ہدایت کا ذریعہ

ایک قاری الرسالہ نے سوال کیا ہے کہ قرآن کی ایک آیت ہے: وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (3:101)۔ اس آیت کے مطابق اعتصام باللہ سے صراط مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی شکل کیا ہے۔ (مولانا فیاض الدین عمری، گلبرگہ، کرناٹک)

قرآن کی مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے "جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہ پہنچ گیا سیدھی راہ پر"۔ خدا سے تعلق کی بنا پر ہدایت ملنے کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن میں فطرت کے شواہد بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شواہد اللہ رب العالمین کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں۔ مثلاً سورہ آل عمران کی آیات 190-194۔ اس طرح کی آیتیں فطرت کی زبان میں خالق کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔

چنانچہ جب فطرت کی یہ نشانیاں دریافت ہوئیں، تو ایک علم وجود میں آیا، جس کو نظریاتی سائنس (theoretical science) کہا جاتا ہے۔ یہ سائنس خالق کی دریافت کا ذریعہ ہے۔ مثلاً اس زمانے میں ایک کتاب لکھی گئی، جس کو کیرالا کے ایک کرشچن مشنری نے چھاپا تھا، اس کتاب کا ٹائٹل یہ تھا:

Nature and Science Speak about God

یہ سائنسی دریافتوں کا اصل ثمرہ تھا۔ مگر بعد میں یہ ہوا کہ نظریاتی سائنس کو تطبیقی سائنس (applied science) کی طرف موڑ دیا گیا، یعنی علمی معرفت کے بجائے مادی منفعت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ ہونے لگا کہ سائنسی دریافتیں خالق کی معرفت کے بجائے مادی منفعت کے لیے استعمال ہونے لگیں۔

اس طرح یہ ہوا کہ نظام فطرت کی جو دریافتیں خالق کی دریافت کا ذریعہ بن رہی تھیں، وہ صنعتی نظام کی صورت میں پیسہ کمانے کا ذریعہ بن گئیں۔ ہنری فورڈ نے موٹر کار بنا کر بہت بڑی انڈسٹری قائم کی، اسی طرح رائٹ برادرس نے ہوائی جہاز بنا کر بہت بڑے ہوائی صنعت کے لیے راہ کھول دی، وغیرہ۔ لیکن یہ لوگ خالقِ کائنات کی دریافت کے چیمپین نہ بن سکے۔

اسلامی روحانیت

روحانیت اگرچہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے، لیکن یہ قرآن وحدیث کی اصطلاح نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانیت اگرچہ باعتبارِ لفظ قرآن میں نہیں ہے، لیکن باعتبارِ معنی وہ قرآن میں موجود ہے۔ یہ قرآنی لفظ الربانیہ (آل عمران، 3:79) ہے، یعنی رب رخی روحانیت:

God Oriented Spirituality

تاہم اسلامی روحانیت مبنی برقلب روحانیت (heart based spirituality) کا نام نہیں ہے۔ مبنی برقلب روحانیت ایک متصوفانہ اصطلاح ہے۔ اسلامی روحانیت دراصل مائنڈ بیسڈ اسپریچوالٹی کا دوسرا نام ہے، یعنی فکر وشعور کی اصلاح۔ اس کا ذریعہ مراقبہ (meditation) نہیں ہے، بلکہ اس کا ذریعہ غور وفکر (contemplation) ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں غور وفکر کرنا اور اُن سے معرفت کا ذہنی یا فکری رزق حاصل کرنا۔ قرآن میں اس موضوع پر جو آیتیں آئی ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مبنی بر ذہن روحانیت (mind-based spirituality) کو مانتا ہے۔ مبنی برقلب روحانیت کا تصور اسلام میں موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی دو متعلقہ آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔" (3:190-191)

مبنی برقلب روحانیت اور مبنی بر ذہن روحانیت میں یہ فرق ہے کہ مبنی برقلب روحانیت ایک پر اسرار تصور ہے۔ مبنی برقلب روحانیت کو معلوم اخلاقیات کی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس، مبنی بر ذہن روحانیت مکمل طور پر مبنی بر عقل روحانیت ہے۔ اس کے اصول بیان کرنا، اسی طرح آسان ہے، جس طرح دوسرے عقلی مضمون کو بیان کرنا۔ مبنی بر ذہن روحانیت ایک معلوم اور قابلِ دریافت روحانیت ہے۔

ظلم یا عصری تقاضا

آج کل لکھنے اور بولنے والوں کا عام انداز یہ ہوگیا ہے کہ وہ ہر بات کو ظلم کے انداز میں لیتے ہیں، وہ اپنی بات اس طرح کہتے ہیں، جیسے کہ مسلمان مظلوم ہیں، اور ساری دنیا ان کے لیے ظالم بن گئی ہے۔ یہ طریقہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے، وہ کسی ظالم کے ظلم کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ عصری تقاضے کا معاملہ ہے۔ عصری تقاضے کو نہ جاننے کی بنا پر وہ اس کو ظلم کا معاملہ بنا کر منفی زبان بولتے ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانہ اظہارِ خیال کی آزادی (freedom of speech) کا زمانہ ہے۔ بین اقوامی اتفاق سے یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنے خیال کا آزادانہ اظہار کرے۔ اس حق میں یہ شامل نہیں ہے کہ اس کی بات کسی کے جذبات کو مجروح کرنے والی نہ ہو۔ اس معاملے میں جو شرط ہے، وہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس کی بات کے ساتھ تشدد (violence) شامل نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اس عصری تقاضے سے واقف نہیں۔ اس لیے جب وہ دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ ایسی بات کر رہے ہیں، جو اس کے اپنے خیال کے مطابق اس کے جذبات کو مجروح کرنے والا ہے، تو وہ بھڑک اٹھتا ہے، حتی کہ تشدد پر اتر آتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ ردِّ عمل عصری تقاضے کے سراسر خلاف ہے۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ اس زمانے میں قول کے مقابلے میں قول کا انھیں پوری طرح حق ہے، لیکن قول کے مقابلے میں تشدد کا ہرگز انھیں اختیار نہیں۔ اظہارِ خیال کی آزادی کسی ایک گروہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ وہ تمام گروہوں کے لیے ہے۔ اگر کوئی شخص اظہارِ خیال کی آزادی کو اپنے فکر کی اشاعت کے لیے استعمال کر رہا ہے تو مسلمانوں کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنے فکر کی اشاعت کے لیے اس آزادی کو استعمال کریں۔ مثلاً اگر دوسرا شخص اسلام کے خلاف کتاب چھاپ رہا ہے تو مسلمانوں کو یہ حق ہے کہ وہ اس کے جواب میں اسلام کے موافق کتابیں تیار کرکے اس کو چھاپیں اور پھیلائیں۔ مگر ان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی قول کا جواب متشدّدانہ ردِّ عمل سے دیں۔

گفتگو کا انداز

حضرت عائشہ کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْرُدُ سَرْدَكُمْ هَذَا، وَلَكِنَّهُ كَانَ يَتَكَلَّمُ بِكَلَامٍ يُبَيِّنُهُ، فَصْلٌ، يَحْفَظُهُ مَنْ جَلَسَ إِلَيْه (سنن الترمذی، حدیث نمبر 3639)۔ یعنی عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح جلدی جلدی نہیں بولتے تھے۔ بلکہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، بالکل صاف صاف، جو آپ کے پاس بیٹھا ہو، وہ یاد کرلے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی گفتگو صاف، واضح اور ہر شخص کے لیے قابل فہم ہونی چاہیے۔ گفتگو کا دو طریقہ ہے۔ ایک وہ ہے، جس کو کہتے ہیں فر فر بولنا۔ اور دوسرا وہ ہے، جس کو کہتے ہیں رک رک کر بولنا۔ فر فر بولنا غلط عادت ہے۔ ایسے لوگوں کو خود بھی یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے کیا کہا، اور نہ سننے والوں کو ان کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے برعکس، گفتگو کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ اس طرح سننے والا اس کی بات کو پکڑے گا۔ اور پھر جواب میں جو کچھ کہے گا، وہ بھی سوچی سمجھی بات ہوگی۔

جلدی جلدی بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جس آدمی کو تیز تیز بولنے کی عادت ہو، وہ نہ اپنی بات کو صحیح طور پر کہہ پائے گا، اور نہ سننے والا اس کی بات کو صحیح طور پر سن سکے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ جو بولے وہ سوچ سمجھ کر بولے تاکہ سننے والا اس کو پوری طرح سمجھے، اور اگر اس کی بات جواب طلب بات ہے تو اس کا صحیح انداز میں جواب دے۔

جو آدمی رک رک کر بولے، وہ سوچ سمجھ کر بولے گا۔ اور جو فر فر بولنے کا عادی ہو، وہ بولے گا، لیکن وہ خود بھی اپنی بات کو سمجھ نہیں پائے گا، اور نہ سننے والا سمجھے گا کہ اس کو سامنے والے نے کیا کہا۔ مزید یہ کہ بولنے کا انداز آدمی کی شخصیت کا تعارف ہے۔ ایک طریقہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی سنجیدہ شخصیت کا حامل ہے، اور دوسرا طریقہ آدمی کی شخصیت کا برعکس تعارف پیش کرتا ہے۔

وعظ کون کرے

ایک بزرگ نے فرمایا: وعظ وہ شخص کرے جس کو وعظ کا کم سے کم اتنا تقاضا ہو جتنا ایک شخص کو رفعِ حاجت (answering the call of nature) کا ہوتا ہے۔

وعظ کا مطلب ریکارڈ بجانا نہیں ہے اور نہ یہ مقصد ہے کہ ایک شاندار تقریر کرکے لوگوں سے یہ داد لی جائے کہ کیا خوب بولے۔ وعظ کا مطلب اپنے اندرون کو انڈیلنا ہے، ایک پائی ہوئی حقیقت کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ایک چھپی ہوئی بات کو لوگوں پر کھولنے کے لیے زندہ گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اس قسم کا وعظ محض کچھ الفاظ بولنا نہیں بلکہ ایک مشکل ترین عمل کرنا ہے۔ کوئی شخص حقیقی معنوں میں یہ عمل اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ وہ اپنی بات کو کہنے کے لیے اتنا مضطرب ہو چکا ہو کہ وہ محسوس کرے کہ اس کو ہر قیمت پر اپنی بات لوگوں تک پہنچانی ہے، خواہ اس کے لیے لوگ اس سے ناراض ہو جائیں اور خواہ اس کی راہ میں اس کو اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔

یہی معاملہ تحریر کا بھی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اتنا زیادہ مطالعہ کرے کہ معلومات اس کے ذہن سے ابلنے لگے۔ متعلقہ موضوع پر جو ذخیرہ تیار ہو چکا ہے اس کو چھاپنے کے بعد وہ محسوس کرے کہ اب بھی کچھ لکھنے کے لیے باقی ہے۔ اس کا حال یہ ہو جائے کہ اس کی معلومات تھامے نہ تھمے اور اس کی بے تابی روکے نہ رکے۔ جب یہ نوبت آجائے اس وقت آدمی کو لکھنے کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اس کے بغیر جو لوگ لکھیں وہ صرف سفید کاغذ کو سیاہ کرنے کا کام کریں گے اور اس کے بغیر جو لوگ بولیں وہ صرف فضائی شور وغل میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔ اس طرح کا لکھنا اور بولنا نہ سننے والوں کو کوئی فائدہ دیتا ہے اور نہ سنانے والوں کو۔

واعظ کا وعظ کوئی کھیل تماشا نہیں، وہ بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے۔ اس کام کو کرنے کا حق صرف اس شخص کو ہے جو اپنی ہستی کو خدا میں گم کردے۔ جو لوگ اس کے بغیر واعظ بنیں وہ حقیقۃً مجرم ہیں، نہ کہ واعظ۔

فرقان کا اصول

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقاناً (8:29)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھیں فرقان عطا کرے گا۔

فرقان کا لفظی مطلب ہے فرق کرنے والا۔ ابن عاشور التونسی (وفات 1393ھ) نے فرقان کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا ہے: وَهُوَ مَا يُفَرِّقُ أَيْ يُمَيِّزُ بَيْنَ شَيْئَيْنِ مُتَشَابِهَيْنِ (التحریر والتنویر، جلد 9، صفحہ 326)۔ یعنی وہ صلاحیت جو دو مشابہ چیزوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ (وفات 1810ء) نے فرقان کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا ہے: بَصِيرَةٌ فِي قُلُوبِكُمْ تُفَرِّقُونَ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ (تفسیر مظہری، جلد 4، صفحہ 54)۔ یعنی اللہ تمھارے دلوں میں بصیرت عطا کرے گا، جس سے تم حق اور باطل میں تمیز کرلو گے۔

آج کے الفاظ میں اس کو قوتِ تمییز (the art of differentiation) یا معیار (criterion) کہا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ صلاحیت جس کی روشنی میں انسان ظاہری پہلوؤں سے دھوکا کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکے۔ وہ اِدھر اُدھر کے مغالطوں میں الجھے بغیر اصل حقیقت تک پہنچ جائے۔

فرقان کے معاملے کو دو اصحابِ رسول کے واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے: عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، يَقُولُ: كَانَ بَيْنَ خَالِدٍ وَسَعْدٍ كَلَامٌ، فَذَهَبَ رَجُلٌ يَقَعُ فِي خَالِدٍ عِنْدَ سَعْدٍ، فَقَالَ: مَهْ إِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 94)۔ یعنی طارق بن شہاب روایت کرتے ہیں کہ خالد بن ولید اور سعد بن ابی وقاص کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی۔ اس کے بعد ایک شخص حضرت سعد کے پاس آیا اور حضرت خالد کی بُرائی کرنے لگا۔ اس پر حضرت سعد نے اس سے کہا: دور ہو جاؤ، ہمارے درمیان جو کچھ ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا— حضرت سعد کی بات کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان جو اختلاف ہے، اس بنا پر ہم اپنی آخرت کو برباد نہیں کریں گے۔ یہی ہے فرقان کی صلاحیت۔

استقامت کی صفت

استقامت کیا ہے۔ استقامت کا مطلب ہے ناموافق حالات کے باجود پوری دلجمعی سے اپنے مقصد پر لگے رہنا۔ یہ صفت دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں کوئی مقصد آتا ہے تو اسی کے ساتھ دوسرے تقاضے بھی آتے رہتے ہیں۔ یہ دوسرے تقاضے انسان کو اس کے مقصد سے بار بار بھٹکاتے (disctract) ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو ڈی ریل (derail) ہونے سے بچائے۔ جس لائن کو انسان نے بطورِ مقصد اختیار کیا ہے، وہ اس لائن سے نہ ہٹے۔

زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی کو کامیابی ہی کامیابی حاصل ہوتی جائے۔ انسان کو بار بار ایسے تجربات پیش آتے ہیں، جو اس کے لیے ناخوشگوار تجربات ہوتے ہیں۔ یہ ناخوشگوار تجربات آدمی کو استقامت کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں استقامت پر قائم رہنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ وہ یہ کہ آدمی وقتی نقصان سے بددل نہ ہو۔ وہ وقتی نقصان کے باوجود اپنے سوچے سمجھے راستے پر قائم رہے۔

استقامت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کو زندگی میں سیدھا راستہ مل جائے، جو مڑے بغیر ہمیشہ سیدھی سمت میں چلتا رہے۔ ہمیشہ ایسا ہوگا کہ زندگی میں ناموافق حالات پیش آئیں گے، جو اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ مگر یہ رکاوٹیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے رکاوٹ نہیں ہوں گی، بلکہ وہ اس کے لیے مزید بہتر انداز سے مقصد کو سمجھنے اور منزل کی طرف آگے بڑھنے کا ذریعہ ہوگا۔ انگریزی زبان کا ایک مقولہ ہے، جو زندگی کی اس فطری حقیقت کو مزید قابلِ فہم (illustrate) کرتا ہے:

It is not ease, but effort, not facility but difficulty, makes men.

آسانی نہیں، بلکہ جدوجہد، سہولت نہیں، بلکہ مشکلات انسان کو انسان بناتی ہیں۔

غلطی کا اعتراف

ایک صاحب جو بروقت بے روزگار ہیں، ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی روزگار مل جائے۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ پہلے وہ ایک بہت اچھی جاب میں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے غلط منصوبے کی وجہ سے اس جاب کو چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ پریشانی کے عالم میں ہیں۔

میں کہوں گا کہ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اپنی غلطی کو نہ ماننا۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق کی اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے، یعنی مسئلے کے ساتھ اس کا حل۔ مگر انسان بے اعترافی کے مزاج کی بنا پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو مسئلے کا حل بھی نہیں مل پاتا۔

گہرائی کے ساتھ غور کیجیے تو اس دنیا میں مسئلہ ہمیشہ خود اپنی غلطی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ چوں کہ آدمی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ اس لیے مسئلے کا حل بھی اس کو سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنی غلطی کو ماننا ہمیشہ مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ اگر آدمی اپنی غلطی کو کھلے دل سے مان لے تو فوراً مسئلہ کی شناخت بھی ہو جائے گی، اور مسئلے کا حل بھی معلوم ہو جائے گا۔

اپنی غلطی کو نہ ماننے کا مطلب کیا ہے۔ اپنی غلطی کو نہ ماننا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بند ذہن کے ساتھ سوچتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنی جگہ سے ہٹنا بھی نہ پڑے، یعنی اپنی غلطی پر قائم رہے، اور اس کو مسئلے کا حل بھی مل جائے۔ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنی جگہ سے ہٹے۔ تاکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ سوچ سکے، اور حقیقت کو جان سکے۔ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنا اس معاملے میں نیا سفر شروع کرنے کے لیے پہلا قدم ہے۔ آدمی جب تک غلطی پر قائم رہے گا، وہ کبھی بھی اپنے لیے صحیح راہ عمل کو دریافت نہیں کر سکے گا۔

کنفیوزن کیوں

لوگوں کی گفتگو سنیے یا ان کی تحریر کو پڑھیے۔ ہمیشہ ایسا پائیں گے کہ ان کی تقریر یا تحریر میں وضوح (clarity) نہیں ہوتا۔ ساری گفتگو یا ساری تحریر کو پڑھ ڈالیے۔ آپ کو اس سے کوئی ٹیک اوے (takeaway) نہیں ملے گا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ اگر پہلے انھوں نے ایک غلط بات کہہ دی تھی، تو بعد کو اس کی غلطی کا اعتراف کیے بغیر نئی بات بولنے لگے۔ اس دوطرفہ بیان سے اس کی بات میں کوئی وضوح نہیں آسکتا۔ مثلاً اگر وہ کل تک ٹکراؤ کی پالیسی کو چلاتے رہے ہیں، اور آج وہ یہ دعوت دیں کہ صبر کرو تو کسی کو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ان کا صبر کیا ہے۔ اس قسم کا دہرا طرز فکر ہمیشہ کنفیوزن پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی بات سننے یا پڑھنے سے کسی کو کوئی ٹیک اوے نہیں ملتا۔

کلام میں کنفیوزن زیادہ تر اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کیے بغیر ایک اور بات بولنے لگتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے کلام میں وضوح (clarity) ہو۔ آپ کے کلام میں لوگوں کو ٹیک اوے ملے۔ آپ کے کلام سے لوگوں کے سامنے راہِ عمل واضح ہو تو سب سے پہلے اپنی غلطی کا اعتراف کیجیے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مختلف قسم کی باتیں بولتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد چاہتے ہیں کہ لوگوں کو ایک صحیح بات کی رہنمائی دیں۔ اس طرح کی بات میں لوگوں کو کبھی واضح رہنمائی نہیں ملتی۔ صحیح رہنمائی دینے کے لیے آپ کو ایسا کرنا پڑے گا کہ آپ صحیح کو صحیح کہیں، اور غلط کو غلط بتائیں۔ اس طرح کے کلام سے لوگوں کے ذہن میں صحیح اور غلط الگ الگ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس، اگر آپ ایسا کریں کہ صحیح میں غلط ملائیں، اور غلط میں صحیح ملائیں تو آپ کے کلام میں لوگوں کو کبھی واضح رہنمائی نہیں ملے گی۔ آپ کو ایسا کرنا ہوگا کہ آپ غلط کو غلط بتائیں، خواہ ایسا کرنے میں آپ کی اپنی ذات غلط ہو رہی ہو۔

بیانیہ انداز

مسلم اہل علم کی تحریروں میں عام طور پر بیانیہ اسلوب کا رواج ہے۔ بیانیہ اسلوب یہ ہے کہ آدمی ایسی بات کہے جو اس کے اپنے ذہن کی بات ہو، لیکن اس کے ذہن کے باہر اس کا کوئی واقعاتی مصداق موجود نہ ہو۔ یعنی دلیل اور شواہد کو بتائے بغیر کوئی بات کہنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں ہر جگہ محصور حالت (under siege) میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس صورت حال پر میں نے غور کیا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ یہ قدیم شاعرانہ اسلوب کا تسلسل (extension) ہے۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں شاعرانہ اسلوب کا رواج تھا۔ موجودہ زمانے میں جب سائنسی طریقہ رائج ہوا تو اس اسلوب کا خاتمہ ہو گیا۔ اس بنا پر آج کی دنیا میں شعر (poetry) کے بجائے نثر (prose) کی اہمیت ہو گئی۔ اس حقیقت کو پہلی بار میں اس وقت سمجھا جب کہ میں نے مندرجہ ذیل کتاب پڑھی جو کہ 1965 میں شائع ہوئی:

The Great Intellectual Revolution

یہ کتاب جان فریڈرک ویسٹ نے لکھی ہے۔ اس کتاب کا ایک باب یہ تھا:

The Death of Metaphor

یعنی تمثیلی اسلوب کا خاتمہ۔ (اس کا ترجمہ الرسالہ، اکتوبر، 1985 اور دسمبر، 2019 میں اس عنوان کے تحت چھپ چکا ہے: ادبی انقلاب)۔ اس میں ولیم شیکسپیئر (1564-1616ء) اور جان ملٹن (1608-1674ء)، وغیرہ کا مطالعہ کر کے اس معاملہ کو واضح کیا گیا ہے۔ مغربی ملکوں میں ایگزیکٹ سائنس (exact sciences) کے رواج کی بنا پر سائنٹفک اسلوب پر مبنی یہ تحریری کلچر طرح رائج ہو چکا ہے۔ سائنٹفک اسلوب سادہ اسلوب ہے۔ وہ حقیقت نگاری کا دوسرا نام ہے، یعنی دلائل وشواہد کی بنیاد پر دیا گیا بیان۔ اس کے برعکس، مسلم سماج میں سائنٹفک ذہن نہ ہونے کی وجہ سے بیانیہ اسلوب ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ بیانیہ اسلوب کا مطلب ہے دلائل وشواہد سے خالی مفروضہ بیان۔ یعنی آدمی ایسی بات کہے جو مدلل (well-grounded) نہ ہو، بلکہ خیالی بات ہو، جس کا حقیقی مصداق اس کے ذہن کے باہر موجود نہ ہو۔

خوشی کیا ہے

خوشی کیا ہے (what is happiness)۔ خوشی اپنی پسند کو حاصل کرنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ حالات کو مینج کرنے کا نام ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ حالات کی رفتار اس کی مرضی کے مطابق ہوجائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ہے۔ حالات ہمیشہ خدا کی وسیع تر منصوبہ بندی کے تحت پیش آتے ہیں۔ آدمی کے لیے واحد چوائس (choice) یہ ہے کہ وہ اللہ رب العالمین کی منصوبہ بندی کو دریافت کرے، اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ایڈجسٹ کرے۔ انسان اگر ایسا کرے تو اس کو ہر صورتِ حال میں خوشی حاصل ہوگی، اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ ہمیشہ پریشانی میں مبتلا رہے گا۔

خوشی، اپنے مطلوب کو پانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ پائی ہوئی چیز میں اپنے مطلوب کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ آدمی کے لیے ہر چیز خوشی کا سبب بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ ناممکن کو چھوڑ کر ممکن میں اپنی خوشی کو دریافت کرلے۔ یعنی خوشی کا حصول اس طرح ممکن نہیں ہے کہ ناممکن کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ اس کے لیے قربانی کی سطح پر عمل کرنا پڑے۔ بلکہ خوشی کا راز ایڈجسٹ منٹ میں ہے۔ خوشی کا راز ری پلاننگ (re-planning) کے طریقے کو اختیار کرنے میں ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جس سے آپ ملیں، اگر آپ اس کو کرید کر دیکھیں کہ اپنے اندر وہ کیسا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی غیر حاصل شدہ چیز کا غم لیے ہوئے ہے۔ یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ اس میں شاید کسی کا استثنا نہ ہو۔ فطرت کے قانون کے مطابق، غیر حاصل شدہ چیز کا غم بے سود ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی کے لیے جو ناممکن الحصول ہے، وہ اس کو پانے کی کوشش نہ کرے۔ بلکہ اس کو پانے کی کوشش کرے، جو نتیجہ خیز ہو۔ جو انسان اس طریقے کو اختیار کرے، وہی وہ آدمی ہے، جس نے کھونے کے باوجود پالیا۔ خوشی فطرت کے نظام سے ایڈجسٹ کرنے کا نام ہے، نہ کہ فطرت کے نظام کو اپنے موافق بنانے کا۔ خوشی، ایک لفظ میں ملے ہوئے پر قناعت (contentment) کرنے کا نام ہے۔

بے اطمینانی کا سبب

ٹاٹا انڈسٹری کے چیئرمین مسٹر رتن ٹاٹا (پیدائش 1937ء) نے لمبی کوشش کے بعد 2008 میں ایک نئی چھوٹی کار بنائی ہے۔ اِس کار کا نام نانو (Nano) ہے۔ اِس کی قیمت صرف ایک لاکھ روپیے ہے۔ اس کو دنیا کی سب سے سستی کار (cheapest car on earth) کہا جاتا ہے۔

نئی دہلی (پرگتی میدان) میں اِس کار کی نمائش کی گئی تو اس کو دیکھنے کے لیے بہت بڑی بھیڑ اکٹھا ہوگئی۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسٹر رتن ٹاٹا نے بظاہر بے شمار نئے لوگوں کے لیے سستی کار کی شکل میں ایک پُرمسرت تحفہ دیا، لیکن خود رتن ٹاٹا کو روحانی خوشی حاصل نہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (11 جنوری 2008) کی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا— میں اپنے آپ کو اپنی زندگی کے بہت زیادہ تنہائی کے دور میں پاتا ہوں:

I am in a very lonely phase of my life. (p. 1)

یہ کوئی انفرادی مثال نہیں۔ یہی اُن تمام لوگوں کی کہانی ہے جو اپنی ساری توانائی مادّی چیزوں کے حصول میں لگا دیتے ہیں۔ جو اِس طرح رہتے ہیں گویا کہ زندگی کا مقصد مادی ترقی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسے لوگ جب اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچتے ہیں، تو اُن کو محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر مادی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اُن کو اندرونی خوشی حاصل نہیں۔ وہ اِسی طرح جیتے ہیں، یہاں تک کہ مایوسی (despair) کی حالت میں مرجاتے ہیں۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی روح کے لیے سب سے زیادہ ربّانی غذا کی ضرورت ہے۔ صرف مادی غذا انسان کی فطرت کو ایڈریس نہیں کرتی۔ بظاہر خوش خوراکی کے باوجود اس کی داخلی شخصیت، روحانی فاقہ (spiritual starvation) میں مبتلا رہتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔ یعنی، سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (الرسالہ دسمبر 2008، صفحہ 36)

موت کا سفر

انڈیا کے ٹاٹا گروپ کا بزنس ایمپائر 150 سے زیادہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ 9 اکتوبر 2024 کو انڈیا کے تقریباً سبھی نیوز پورٹلس نے ایک برننگ نیوز یہ دی تھی کہ معروف بزنس مین اور ٹاٹا گروپ کے سابق چیئرمین رتن ٹاٹا کا 86 سال کی عمر میں ممبئی کے بریچ کینڈی ہاسپٹل میں انتقال ہو گیا۔ نیوز ایجنسی رائٹر کی ویب سائٹ پر درج ذیل ہیڈ لائن کے ساتھ یہ خبر دی گئی تھی:

Ratan Tata put India's Tata Group on the global map

Oct 9 (Reuters) - Ratan Tata, the former Tata Group chairman who put a staid and sprawling Indian conglomerate on the global stage with a string of high-profile acquisitions, has died, the Tata Group said in a statement late on Wednesday. He was 86. Tata, who ran the conglomerate for more than 20 years as chairman, had been undergoing intensive care in a Mumbai hospital, two sources with direct knowledge of his medical situation told Reuters earlier on Wednesday. (9 Oct 2024)

سوشل میڈیا پر ان کی آخری عمر کی کئی ویڈیو موجود ہیں، جن میں وہ پہلے سے بہت زیادہ کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔ انسانی زندگی پر غور کیجیے تو ہر عورت اور ہر مرد کی یہی کہانی ہے — بچپن، جوانی، بڑھاپا اور آخر میں موت۔ مسٹر ٹاٹا کی موت کی خبر گویا ہر عورت اور ہر مرد کے لیے اس کے اپنی موت کی خبر ہے۔ ہر انسان پر یہ لمحہ یقینی طور پر آتا ہے جب کہ موت کا فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے انسان، تم کو اس دنیا میں صرف "86" سال جینا تھا، یہ مدت پوری ہو چکی۔ اب تم کو ایک اور دنیا میں جانا ہے، جہاں تم ہمیشہ رہو گے۔ ابھی تمہاری زندگی کا صرف ٹیسٹ پیریڈ ختم ہوا ہے، اور اب زندگی کا دوسرا اصل دور شروع ہو رہا ہے۔ ہر انسان کو یہ معلوم ہے کہ موت سے پہلے کے دورِ حیات میں اس کو اپنی کامیابی کے لیے کیا کرنا ہے۔ مگر یہ بات کوئی شخص نہیں جانتا کہ موت کے بعد کے دورِ حیات کے لیے بھی اس کو تیاری کرنی چاہیے جو وہاں کی ابدی زندگی میں اس کے کام آئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی وہ مسئلہ ہے جس سے ہر انسان بے خبر ہے۔ وہ دنیا کی ناکامی سے بچنے کے لیے تو سب کچھ کرتا ہے، لیکن ابدی ناکامی سے بچنے کے لیے وہ کچھ نہیں کرتا۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 162-158)

158

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہدایت کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا ان لوگوں کو جنھوں نے اس کی پیروی کی۔ اور اس سے ان لوگوں کے ثواب میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ اور جس نے گمراہی کی طرف بلایا، اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا کہ ان لوگوں پر جنھوں نے اس کی پیروی کی۔ اور اس سے ان لوگوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2674)

تشریح: آدمی اگر خود کوئی نقطۂ نظر اختیار کرے تو ایسی حالت میں اس کی ذمہ داری صرف اس کی ذات تک محدود رہتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے نقطۂ نظر کا اعلان عام کرکے اس کو دوسروں تک پہنچائے تو اس کی ذمہ داری بہت زیادہ وسیع ہوجاتی ہے۔ اگر وہ ایک صحیح نقطۂ نظر کی اشاعت کر رہا ہے تو اس کے ذریعہ جن لوگوں کی اصلاح ہوگی ان سب کا ثواب اس کو بھی پہنچتا رہے گا۔ اس کے برعکس، اگر وہ غلط نقطۂ نظر کی اشاعت کرے تو اس کے ذریعہ جتنے لوگ گمراہ ہوں گے ان سب کی گمراہی بھی اس کے خانے میں لکھی جاتی رہے گی۔ آدمی کو ذاتی زندگی میں بھی محتاط ہونا چاہیے۔ لیکن اگر وہ دوسروں کو رہنمائی دینے کے لیے کھڑا ہو تو اس کو مزید اضافے کے ساتھ محتاط ہونا چاہیے۔ کیوں کہ اب اس کی ذمہ داری ہزاروں گنا حد تک زیادہ ہوچکی ہے۔

159

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا اور پھر وہ ویسا ہی ہوجائے گا جیسا کہ وہ شروع ہوا۔ پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 145)

تشریح: قدیم عرب کے لوگ اپنے اکابر کے دین پر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے دین خدا کو پیش کیا تو ان کو دین اکابر کے مقابلے میں دین خدا اجنبی معلوم ہوا۔ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، بعد کے زمانے میں خود امت کے اندر بھی یہی صورت پیش آنے والی ہے۔

بگاڑ کے زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ خدا اور رسول والا دین گم ہو جاتا ہے اور دین کی دوسری دوسری شکلیں رائج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً قومی دین، برکت والا دین، رسم و رواج والا دین، آبائی فخر والا دین، لوگ دین کی انھیں خود ساختہ شکلوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ان کے سامنے خالص خدائی دین پیش کیا جاتا ہے تو یہ دینِ خدا دوبارہ ان کو اسی طرح اجنبی معلوم ہوتا ہے جس طرح وہ قدیم زمانے کے لوگوں کو اجنبی دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ وہ خدا اور رسول والے دین کو اجنبی سمجھ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس دورِ اجنبیت میں جو لوگ خالص دین خدا کو پہچانیں اور اس کا ساتھ دیں وہ بہت خوش قسمت لوگ ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اس وقت معرفت کی سطح پر دین کو دریافت کیا جب کہ دوسرے لوگ صرف رواج کی سطح پر دین کو پائے ہوئے تھے۔

160

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1876، صحیح مسلم، حدیث نمبر 147)

تشریح: شاید یہ خدا کا منصوبہ ہے کہ دین کی قدریں جب دوسری جگہ مٹ رہی ہوں اس وقت بھی وہ مدینہ (وسیع تر معنوں میں حجاز) میں موجود رہیں۔ حجاز کو اللہ نے ابدی طور پر مرکز اسلام کی حیثیت دے دی ہے۔ بعد کے زمانے میں جب کہ زمین کے دوسرے حصوں میں غیر اسلامی تہذیب کا غلبہ ہو جائے گا اس وقت بھی حجاز میں کسی نہ کسی درجہ میں اسلام کی مرکزیت باقی رہے گی۔ ایسا غالباً اس لیے ہوگا کہ حجاز میں اسلام کی دو سب سے بڑی عبادت گاہیں واقع ہیں، یعنی کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی۔

ربیعہ الجرشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے والا آیا۔ پھر آپ سے کہا گیا۔ آپ کی آنکھیں سوتی رہیں، اور آپ کے کان سنتے رہیں اور دل سمجھتا رہے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر میری آنکھیں سوگئیں۔ اور میرے دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے (اس کو) سمجھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ (مثال) بیان کی گئی: ایک مالک نے گھر بنایا۔ اس نے وہاں ایک خوان تیار کیا اور بلانے والے کو بھیجا تو جس نے بلانے والے کی دعوت قبول کی، وہ گھر میں داخل ہوا اور خوان سے کھایا اور مالک اس سے خوش ہوا۔ مگر جس نے بلانے والے کی دعوت قبول نہ کی، وہ نہ گھر میں داخل ہوا، نہ اس نے خوان سے کھایا، چنانچہ مالک اس سے ناراض ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ مالک سے مراد اللہ ہے، اور بلانے والے سے مراد محمد ہیں۔ اور گھر سے مراد اسلام ہے۔ اور خوان سے مراد جنت ہے۔ (سنن الدارمی، حدیث نمبر 11)

تشریح: انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے ابدی زندگی چاہتا ہے، لیکن سو سال کے اندر ہی یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنی مرضی کے خلاف اِس دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ زمین پر پیدا ہونے والا ہر انسان دو چیزوں کا تجربہ کرتا ہے۔ پہلے زندگی کا تجربہ، اور اس کے بعد موت کا تجربہ۔ اس قانونِ فطرت سے کسی کو استثنا حاصل نہیں۔ اگر انسان سنجیدگی کے ساتھ ان واقعات پر سوچے تو وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی حقیقت کو دریافت کرے گا، وہ یہ کہ انسان کو پیدا کرکے اِس زمین پر آباد کرنا بطور انعام نہیں ہے، بلکہ وہ بطور امتحان ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے۔ یہ آزادی اِس لیے ہے تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ کون شخص بااصول زندگی گزارتا ہے اور کون شخص بے اصول زندگی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں اسی معاملے کو بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے کامل ہدایت کا انتظام فرمایا۔ اب جو لوگ اس ہدایت کی روشنی میں اپنی آزادی کا درست استعمال کریں گے ان کے لیے کامیابی ہے، اور جو لوگ اس کی پیروی نہ کریں وہ ابدی ناکامی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے ہو۔ اس کے سامنے میرے احکام میں سے کوئی حکم آئے جس کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے میں نے منع کیا ہے۔ پھر وہ کہے کہ میں نہیں جانتا، جو کچھ ہم نے اللہ کی کتاب میں پایا اس کی ہم نے پیروی کی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 23876، سنن ترمذی، حدیث نمبر 2663، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4605، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 13)

شرح: قرآن کی حیثیت بنیادی اصول کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی ربانی اصول کی طرف لوگوں کو بلایا اور اس کو قائم فرمایا۔ اس طرح آپ کی زندگی قرآن کی عملی تشریح بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جاننا لازمی طور پر ضروری ہے۔

دین میں صرف قرآن کی حیثیت حجت (authoritative source) کی ہے، یا حدیثِ رسول بھی دین میں یکساں درجے میں حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک خالص قانونی مسئلہ ہے۔ عملی اعتبار سے جس چیز کی اہمیت ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اسلام کی روح زندہ ہو۔ دین پر عمل کرنے کی تڑپ اس کے اندر پیدا ہوگئی ہو۔ اللہ سے محبت اور اللہ کا خوف اس کے دل میں بھرپور طور پر جاگزیں ہوگیا ہو۔ جن لوگوں کے اندر اسلام کی یہ اسپرٹ پیدا ہوجائے، وہ کسی قانونی فتوے کے بغیر پوری طرح اسلام کو اختیار کرلیں گے، اور جن لوگوں کے اندر اسلام کی روح بیدار نہ ہوئی ہو، ان کے لیے کوئی بھی قانونی فتویٰ عملی بیداری کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ ایک شخص قرآن کو دین میں حجت مانتا ہو، لیکن اس کے اندر دین کی اسپرٹ موجود نہ ہو تو وہ خود قرآن کے احکام پر بھی عمل نہیں کرے گا۔ قرآن کے بارے میں وہ بڑی بڑی بحثیں کرے گا، لیکن اس کی حقیقی زندگی قرآن کی تعلیمات سے خالی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل مسئلہ حدیث کی حجیت کو منطقی طور پر ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ حدیث کی دینی اہمیت اور افادیت کو آدمی کے دل میں اس طرح اتار دیا جائے کہ وہ اُس سے انحراف کا تحمل نہ کرسکے۔

دین میں آسانی

قرآن (2:185) میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا (يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ)۔ دوسری جگہ (22:78) فرمایا کہ اللہ نے تمہارے اوپر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ)۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّ هَذَا الدِّينَ يُسْرٌ (سنن النسائی، حدیث نمبر 5034)۔ یعنی یہ دین آسان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو: إِنَّ خَيْرَ دِينِكُمْ أَيْسَرُهُ (مسند احمد، حدیث نمبر 15936)۔ آپ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ آسانی پیدا کرو، لوگوں کو مشکل میں نہ ڈالو (يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا) صحیح البخاری، حدیث نمبر 69۔

اسی لیے فقہ میں شریعت کے بارے میں یہ اصولی مسئلہ وضع کیا گیا ہے کہ مشقت آسانی لاتی ہے۔ اس اصول پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔ مثلاً حنفی عالم ابن نجیم (وفات 970ھ) نے اصول فقہ پر اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ایک بحث کا عنوان یہ رکھا ہے — الْقَاعِدَةُ الرَّابِعَةُ: الْمَشَقَّةُ تَجْلُبُ التَّيْسِيرَ (چوتھا قاعدہ: مشقت آسانی لاتی ہے)۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین بذات خود کوئی سہولتوں اور آسانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ دین کے راستہ میں جب حالات کے تحت کوئی مشقت کی صورت پیدا ہو جائے تو وہاں لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈھکیلا جائے گا، بلکہ ان کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسی اصول کے تحت بیماری میں وضو کے بجائے تیمم ہے۔ سخت بارش میں مسجد کے بجائے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ سفر میں روزہ چھوڑ دینا ہے، وغیرہ۔

یہی اصول اجتماعی زندگی کے لیے بھی ہے۔ یعنی دین میں آسانی کا یہ اصول صرف فرد کے لیے نہیں ہے، وہ جماعت اور قوم کے لیے بھی ہے۔ جس طرح انفرادی معاملات میں مشکل پیش آنے کی صورت میں فرد کے لیے شریعت کا حکم نرم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جماعت کے لیے بھی سخت حالات میں شریعت اپنے تقاضے کو نرم کر دیتی ہے۔

مثلاً شریعت کا کوئی عمل جس کو اجتماعی صورت میں علی الاعلان کرنا مطلوب ہو۔ لیکن اگر حالات

ایسے ہوں کہ ہائی پروفائل (high profile) میں کام کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو وہاں لو پروفائل (low profile) کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

دینی مقصد کے لیے اقدام کرنا بجائے خود ثواب کا ایک عمل ہے۔ مگر جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہوجائے کہ اقدام کرنا موت کی طرف چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہو وہاں شریعت کا حکم بدل جائے گا۔ اب اقدام کے بجائے اعراض اہل اسلام کے لیے شریعت کا مطلوب عمل بن جائے گا۔

اسی طرح ایک معاشرہ ہے جہاں سیاسی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ اگر سیاسی تبدیلی کو نشانہ بنا کر تحریک چلائی جائے تو ہلاکت کی صورت پیش آجائے گی تو ایسے معاشرہ میں لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے کے بجائے خود حکم کو بدل دیا جائے گا۔ اب وہاں یہ مطلوب ہوجائے گا کہ سیاسی انقلاب کے محاذ سے ہٹ کر انفرادی اصلاح کے میدان میں پرامن کوششیں کی جائیں۔

اسی طرح ایک موقع جہاں اعلان واظہار ایک شرعی مطلوب نظر آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر لاؤڈ اسپیکر کی پرشور تقریر کا طریقہ اختیا کیا جائے تو سماج میں اس کا منفی ردِعمل ہوگا اور اہل اسلام کے لیے شدید تر حالات پیدا ہوجائیں گے۔ تو ایسی حالت میں شور والا عمل ساقط ہوجائے گا، اور شریعت کا تقاضا ہوجائے گا کہ خاموش تدبیر کا انداز اختیار کرکے اپنا مقصد حاصل کیا جائے۔ اس کو فقہا نے بطور اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے: دَرْءُ الْمَفَاسِدِ أَوْلَى مِنْ جَلْبِ الْمَصَالِحِ (الموافقات للشاطبی، جلد 5، صفحہ 300)۔ یعنی نقصانات کو روکنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔

اس قسم کی باتوں کی طرف ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں رہنمائی کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے (لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ)۔ صحابہ نے پوچھا: کوئی شخص اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ آپ نے کہا: کسی ایسے مشکل کام میں وہ پڑ جائے جس سے نمٹنے کی اس میں طاقت نہ ہو (يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيقُ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 2254۔

عُسر سے بچنا اور یُسر کا طریقہ اختیار کرنا یہ ہے کہ بوقتِ عمل یہ دیکھا جائے کہ موجودہ حالات میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں ہے۔ اور پھر ممکن دائرہ میں اپنی قوتوں کو صرف کیا جائے، نہ کہ ناممکن دائرہ میں سر ٹکرا کر مزید اپنے نقصان میں اضافہ کرلیا جائے۔

ڈائری 1986

17 جون 1986

موجودہ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ انسان کا پیدائشی گناہ گار ہونا اور خدا کے بیٹے کا مصلوب ہو کر اس کا کفارہ بننا، یہی وہ خاص عقیدہ ہے جس پر موجودہ عیسائیت کھڑی ہوئی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس سے وہ اسی کی تبلیغ کرتی رہی ہے۔

مگر اس عقیدہ کی کوئی اصل آسمانی تعلیمات میں موجود نہیں۔ حتیٰ کہ خود بائبل (پرانا عہد نامہ، نیا عہد نامہ) میں بھی نہیں۔ موجودہ محرف بائبل بھی اس عقیدہ سے خالی ہے۔

کیتھولک چرچ کے ایک جرمن عالم ریورنڈ ہربرٹ ہاگ نے ایک کتاب لکھی ہے:

Rev Herbert Haag: *Is Original Sin in Scripture*, New York, 1969

اس کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ عیسائی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابتدائی زمانہ کے عیسائیوں میں تیسری صدی عیسوی تک اس عقیدہ کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔ ابتدائی تین صدیوں کے بعد یہ عقیدہ عیسائیت میں داخل ہوا۔ شروع شروع میں جب بعض عیسائیوں نے یہ نظریہ پیش کیا تو 2 سو سال تک یہ حال رہا کہ عیسائی علما اس کو ماننے سے انکار کرتے رہے۔ آخر کار سینٹ آگسٹین (304-430ء) نے یونانی منطق کے زور پر، نہ کہ حضرت مسیح کی تعلیمات کے زور پر، اس عقیدہ کو ایک بنیادی مسیحی عقیدہ کے طور پر مسیحیت میں داخل کر دیا۔ اس عقیدہ کا خلاصہ یہ تھا کہ — آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر جو گناہ کیا تھا وہ گناہ انہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ پوری نسل انسانی نے اس کا وبال وراثت میں پایا ہے۔ اور اب انسان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ مسیح کے کفارہ کے ذریعہ نجات حاصل کرے۔

18 جون 1986

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ النجم کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

"انبیاء علیہم السلام آسمان نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی

ہے۔ اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب درخشاں طلوع ہوتا ہے ایسے ہی تمام انبیاء کی تشریف آوری کے بعد آفتاب محمدی مطلع عرب سے طلوع ہوا"۔ (صفحہ 682)

تمثیل کے ذریعہ استدلال کتنا غلط ہوتا ہے، اس کی ایک مثال مذکورہ بالا اقتباس ہے۔ علم افلاک کی رو سے ستارے کبھی غائب نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح آفتاب سب سے بڑا اور درخشاں نہیں ہے۔ اس سے بہت زیادہ بڑے اور درخشاں ستارے آسمان میں موجود ہیں۔ استدلال ہمیشہ واقعات وحقائق کی بنیاد پر ہونا چاہیے، نہ کہ تمثیلات کی بنیاد پر۔ کسی نے صحیح کہا ہے:

"Analogy is the weakest form of argument."

19 جون 1986

کونسل فار دی ورلڈز ریلیجنز (نیو یارک) کے تحت بنگلور میں ایک مختلف مذاہب کانفرنس ہوئی۔ اس کی تاریخ 26-30 جون 1986 ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ کانفرنس کے لیے میرے پیپر کا عنوان ہے:

Missionary Ethics

تفصیلی پروگرام کے مطابق اس کانفرنس میں مجھے ڈاکٹر راجندر ورما کے پیپر کا respondent بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر ورما آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور آج کل دہلی میں رہتے ہیں۔ کل ان کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے کہا کہ میرا ٹکٹ تو آ گیا ہے، مگر میرا ارادہ بنگلور جانے کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر ورما نے کہا کہ آپ کو ضرور چلنا چاہیے۔ اس کے بعد آج صبح 10 بجے وہ خود ہمارے دفتر (نظام الدین) میں آئے۔

اس سلسلہ میں بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ کل جب ڈاکٹر ورما کا ٹیلی فون آیا تو میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر ورما کون ہیں۔ مگر ٹیلی فون کی مختصر گفتگو کے بعد میرا ذہن اچانک ایک شخص کی طرف چلا گیا جن سے میں سات مہینے پہلے ملا تھا۔

نیو یارک جاتے ہوئے ممبئی ایئر پورٹ پر ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ 14 نومبر 1985 کا واقعہ ہے۔ یہ ملاقات بس ایئر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک دو منٹ کی تھی۔ ان کے چہرے کا ایک عکس میرے ذہن میں تھا۔ ٹیلی فون کی گفتگو کے بعد اچانک میرے دل نے کہا کہ یہ

وہی شخص ہیں جن سے بمبئی ایئر پورٹ پر تھوڑی دیر کے لیے ملاقات ہوئی تھی۔ وجدانی طور پر میں نے ٹیلی فون کی آواز میں اور ایئر پورٹ پر دیکھے ہوئے چہرہ میں ایک مشابہت محسوس کی۔

آج صبح دس بجے جب وہ میرے دفتر میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ٹیلی فون پر بولنے والی آواز عین انہیں صاحب کی تھی جن کو میں نے سات ماہ پہلے بمبئی ایئر پورٹ پر دیکھا تھا۔

اللہ نے دماغ کو بھی کیسا عجیب کمپیوٹر بنایا ہے۔

20 جون 1986

جناب نسیم علی خاں صاحب سے آج دفتر میں ملاقات ہوئی۔ وہ بمبئی میں رہتے ہیں۔ ان سے میں نے بتایا کہ بمبئی کے ایک صاحب کا خط تقریباً چھ ماہ پہلے آیا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ انگریزی الرسالہ زبان و بیان کی خوبیوں سے یکسر محروم ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انگریزی الرسالہ کی خریداری بھی بند کر دی۔

ان کو میں نے لکھا کہ آپ مثال کے ذریعہ اپنی بات کو واضح فرمائیں۔ یعنی انگریزی الرسالہ کا کوئی مطبوعہ پیراگراف لے کر نشان دہی کریں کہ اس میں زبان کی یا بیان کی کون سی خرابی ہے۔ مگر ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس دوران میں یاد دہانی کے کئی خطوط لکھے گئے، مگر ابھی تک جواب سے محرومی ہے۔

نسیم علی خاں صاحب نے بتایا کہ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں اور اس خط و کتابت سے بھی واقف ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ آپ کا خط ملنے کے بعد انہوں نے انگریزی الرسالہ کا ایک پرچہ آر ایس ایس کے بمبئی یونٹ کے سکریٹری کو دیا اور کہا کہ اس کو پڑھ کر اس پر بھرپور تنقید کریں۔ آر ایس ایس کے سکریٹری نے پرچے کو پڑھا اور اس کے بعد اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا:

"الرسالہ کی لینگویج فرسٹ کلاس ہے۔ اس کے آرٹیکل بھی بہت اچھے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی جس پر میں کرٹیسائز کروں"۔

مذکورہ سکریٹری (آر ایس ایس) بہت اچھے اور مانے ہوئے انگریزی داں ہیں۔ ان کے اس تبصرے کے بعد اب ان کے پاس کہنے کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔

میں نے نسیم علی خاں صاحب سے کہا کہ ان کو میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ اب آپ کا چپ ہونا سراسر بزدلی ہے۔ آپ کو بہادری والا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ تحریری طور پر مذکورہ سکریٹری کا واقعہ لکھیں اور کھلے لفظوں میں اعتراف کریں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔

پھر میں نے نسیم علی خاں صاحب سے کہا کہ بہادری (الحماسہ) انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ جس آدمی کے اندر بہادری ہوگی، اس کے اندر بقیہ صفتیں اپنے آپ ہوں گی اور جس شخص کے اندر بہادری نہیں ہوگی، اس کے بعد وہ تمام اعلیٰ اوصاف سے بھی محروم ہوگا۔

22 جون 1986

ابوظبی (یو اے ای) سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے: المنار۔ اس کی اشاعت جنوری 1986 (ربیع الآخر 1406ھ) میں صفحہ 23 پر ایک مضمون ہے۔ اس مضمون میں اس کے عرب مضمون نگار نے لکھا ہے: المُسْلِمُونَ الَّذِينَ يُجِيدُونَ القَوْلَ وَلَا يُحْسِنُونَ العَمَلَ أَكْثَرُ ضَرَرًا عَلَى الإِسْلَامِ مِنْ أَعْدَائِهِ (جو مسلمان اچھی باتیں کرتے ہیں، مگر ان کا عمل اچھا نہیں ہے، وہ اسلام کے لیے اس سے بھی زیادہ مضر ہیں جتنا کہ اس کے دشمن)۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں درج ذیل حدیث نقل کی ہے: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالى يُحِبّ إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُمْ عَمَلاً أَنْ يُتْقِنَهُ (مسند ابی یعلیٰ، حدیث نمبر 4386)۔ یعنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس کو پسند فرماتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب ایک کام کرے تو وہ اس کو بہترین طور پر کرے۔

جب اللہ کی پسند یہ ہے کہ آدمی اپنے کام میں اپنی اعلیٰ ترین صلاحیت استعمال کرے اور وہ اس کو بہتر سے بہتر انجام دے تو اللہ اس کو کیسے پسند کرسکتا ہے کہ آدمی کے قول و فعل میں مطابقت نہ ہو۔ وہ کہنے کے لیے اچھی اچھی باتیں کہے، مگر جب کرنا ہو تو نہ کرے۔

عمل میں قول کی مطابقت پہلا درجہ ہے اور عمل میں خوبی اس کے آگے کا درجہ۔ جب اللہ کو یہ گوارا نہیں کہ آدمی اچھا عمل کرنے میں کوتاہی کرے تو اللہ کو یہ کیسے گوارا ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قول اور اپنے عمل میں مطابقت نہ کرے۔

ایک انٹرویو

(دوسری قسط)

سوال: مولانا، ہماری دینی جماعتوں نے تعمیر کردار، تطہیر افکار اور تطہیر سیاست کا کام ایک ساتھ شروع کیا ہوا ہے اور ان تین کاموں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں یہ جماعتیں اس کام میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ تعمیر افراد کا کام ان جماعتوں سے نہیں ہوسکا۔ دیکھئے، جب آپ کوئی تحریک اٹھاتے ہیں تو دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے کہ main thrust کس چیز پر ہے۔ اگر مین تھرسٹ اپنی ذات پر ہے تو احتسابِ ذات کا جذبہ ابھرے گا اور اگر مین تھرسٹ خارج پر ہے تو احتسابِ نظام کا جذبہ ابھرے گا۔ جہاں احتساب نظام کا جذبہ ابھرے گا، وہاں اصلاح ذات کا کام نہیں ہوسکتا۔ ان جماعتوں کا مین تھرسٹ نظام پر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اصلاحِ ذات اصل کنسرن کی حیثیت سے عملاً حذف ہو گیا۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی جس قسم کی تعبیر دین سے متاثر ہوگا وہ ہر مسئلہ کو اسی رنگ میں دیکھے گا۔ سیاست دین کا ایک جزء ہے، مگر وہ مرکزی جزء نہیں۔ لیکن اگر آپ اس کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر مرکزی جگہ رکھ دیں اور دین کی ایسی تشریح کریں کہ سیاسی انقلاب ہی اسلامی تحریک کا آخری مقصود نظر آنے لگے تو یقینی طور پر آپ کے سوچنے کا انداز بدل جائے گا۔ جماعت اسلامی کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ اب جو لوگ اس کی پیروی کر رہے ہیں ان کا انجام بھی وہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ نے انسان کے دو دل نہیں بنائے۔ مطلب یہ کہ انسان بیک وقت دو چیزوں پر فوکس نہیں کرسکتا۔ ایک طالب علم یا تو ڈاکٹر بن سکتا ہے یا دادا گیری کرسکتا ہے۔ احتساب نظام بھی ہو اور احتساب خویش بھی۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور انسانی فطرت سے ٹکراؤ مول لے کر آپ کام نہیں کرسکتے۔

سوال: لیکن مولانا، جن جماعتوں نے تعمیر افراد اور احتساب ذات کے کام پر ہی توجہ مرکوز رکھی اور احتسابِ نظام سے کامل علیحدگی اختیار کرلی، ان کے اثرات بھی معاشرے پر محدود ہی ہیں۔ جیسا کہ تبلیغی جماعت نے فرد کی تعمیر کو اپنا مقصود قرار دے دیا ہے اور امورِ سیاست سے بالکل کٹ گئی ہے؟

جواب: دراصل یہ تحریک جس کا آپ نے ذکر کیا خوش عقیدگی کی بنیاد پر اٹھی ہے۔ اس کا لٹریچر فضائل تک محدود ہے۔ اب خوش عقیدگی ایک چیز ہے اور فکری تبدیلی دوسری چیز۔ یہ خوش عقیدگی نہیں تو کیا ہے کہ مسواک کرو تو جنت مل جائے گی۔ اس طرح کے اندازِ کار سے فکری تبدیلی نہیں آتی اور نہ معاشرے پر دیرپا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

قرآن وسنت کے مطالعے سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم کے ہیں۔ ایک تقاضا دین کی اصل اور روح ہے، وہ ہے اللہ کی معرفت اور اس سے خشیت اور محبت کا تعلق۔ اس کے اوپر اعتماد، اس کی عبادت اور معاملات زندگی میں اس کی تابعداری۔ دوسرا تقاضا وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ دین کو فکری اور عملی طور پر سربلند رکھنے کے لیے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور موقع کے اعتبار سے ہر جگہ مومن کو ان سے نپٹنا پڑتا ہے۔ کہیں رکانہ (بن عبد یزید) سے کشتی لڑنی پڑتی ہے، کہیں حسان بن ثابت کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ بذریعہ اشعار مخالفین کا جواب دیا جائے۔ کہیں عقل کو مطمئن کرنے کے لیے وقتی اسلوب میں حجت ابراہیمی پیش کرنی ہوتی ہے، کہیں بدر وحنین کے معرکے درپیش ہوتے ہیں، کہیں غیر مسلموں سے معاہدہ کرنا پڑتا ہے، وغیرہ، وغیرہ۔

جہاں تک پہلے تقاضے کا تعلق ہے وہ دین کی اصل ہے اور دائمی طور پر دین کے مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر دوسری چیز کی یہ حیثیت نہیں۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے، نہ کہ حقیقی۔ جس وقت اس طرح کے تقاضے بروئے کار آچکے ہوں، اس وقت یہ اضافی جزء بھی حقیقی جزء کی طرح مطلوب قرار پاتا ہے۔ مگر جب حالات نے اس کی ضرورت پیدا نہ کی ہو اس وقت مومن کے اوپر اس طرح کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

تبلیغ دین کا کام ایک ایک فرد میں حقیقتِ دین کو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ یہ بات میں تبلیغ کی اصل یعنی دعوت کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں، نہ کہ اس کے مخصوص طریقِ کار کے اعتبار سے۔ کیونکہ طریقِ کار خواہ وہ کسی بھی جماعت یا تحریک کا ہو، ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ لیکن تبلیغ کی ساری اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی دین کے لیے کچھ اور کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس دوسرے میدان میں امت کے دوسرے موزوں افراد کو جدوجہد کرنی چاہئے اور خود تبلیغ کرنے والوں کو اخلاص کی شرط کے ساتھ ان کی کوشش کو تسلیم کرنا چاہئے اور انفرادی طور پر اس میں حصہ لینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم کو یہ چیلنج درپیش ہے کہ مغربی افکار کے حملہ کو

روکا جائے اور عملی طور پر دین کی مدافعت کی جائے۔ پھر یہ کہ جدید دنیا میں مسلمانوں کو عزت اور سربلندی کا مقام دلانے کی تدبیریں کی جائیں، جدید ضرورتوں کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین کی جائے، موجودہ حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کا ایک نیا نظام مرتب کیا جائے، جمہوریت اور سیکولرزم سے وقتی طور پر پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے، جدید ذہن کے لحاظ سے اسلام کا دعوتی لٹریچر تیار کیا جائے۔ یہ سارے کام کوئی ایک شخص یا گروہ اکیلا سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ہر ایک دوسرے کو تسلیم کرے اور ایک دوسرے سے مشورہ کرے اور کم از کم انفرادی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کرے۔ اس قسم کا تبلیغی کام جو موجودہ دور میں تبلیغی جماعت کر رہی ہے، کافی نہیں۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ خوش عقیدگی ہی کو تبلیغ کا مقصد قرار نہ دے دیا جائے، اس لیے کہ اس سے فکری تبدیلی کی راہ ہموار نہیں ہوسکتی۔

سوال: بعض اصحاب فکر کا خیال ہے کہ انبیائے کرام کے بعد دعوتی، علمی اور سیاسی کام کسی ایک شخصیت میں نہ جمع ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ صحابہ کرام نے تقسیم کار کے اصول ہی کو اختیار کیا۔ اب بھی تقسیم کار کا اصول اختیار کر کے دینی کام میں پیش رفت ہوسکتی ہے۔ یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ اس معاملہ میں انبیائے کرام کی تقلید نہیں کی جاسکتی کہ ان کے خیال میں ان کی ذات میں یہ سارے کام جمع ہو گئے تھے۔ کیا تقسیم کار کی اس تعبیر سے آپ اتفاق کرتے ہیں؟

جواب: تقسیم کار کے اصول سے مجھے اصولی طور پر اتفاق ہے، لیکن تقسیم کار کس چیز میں، اس میں نہیں کہ تم دعوت کا کام کرو، تم انقلاب کا کام کرو، تم جا کر ان کو گولی مارنے کا کام کرو اور میں پڑھاتا ہوں، وغیرہ۔ یہ تقسیم کار نہیں، مقصد کو فوت کرنے کے ہم معنی ہے۔ بلکہ مرحلہ اول میں جس چیز کی ضرورت ہے اس میں تقسیم کا اصول اختیار کیا جائے۔ جیسے فکری انقلاب لانا ہے تو فکری کام میں تقسیم کار ہوگی۔ کچھ لوگ تحقیق کا کام کریں، کچھ اخبار نکالیں، کچھ لائبریریاں قائم کریں، وغیرہ وغیرہ۔

سوال: آپ کا خیال ہے کہ مرحلۂ اول میں جو کام درکار ہیں ان میں تدریج کار ہے، ان میں تقسیم کار نہیں؟

جواب: جی ہاں، تدریج کار ہے۔ انبیائے کرام نے بھی اس طرح کی تقسیم کار کے مطابق کام نہیں کیا، بلکہ تدریج کار کے مطابق کام کیا ہے۔ یہ واقعہ کے خلاف ہے کہ انبیائے کرام نے بیک وقت تمام کام کیے۔ اس کا ثبوت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے ملتا ہے۔ مکہ میں صرف نظریہ کی

تبلیغ کی۔ شراب اور زنا کو چھوڑنے کا حکم تک نہ اترا۔ کعبہ میں بت نصب تھے، ان کو چھیڑنے کا حکم نہ اترا۔ اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ رسول اللہ نے کم از کم تیرہ سال تک اپنے آپ کو مرحلہ اول تک محدود رکھا۔ بعد ازاں بتدریج احکام اترنے لگے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تدریج کار کے مطابق کام کیا، تقسیم کار کے مطابق نہیں۔

سوال: ہمارے ہاں اقتدار کے بغیر اطاعت فی المعروف کی بنیاد پر بعض جماعتیں قائم کی گئی ہیں۔ جن کا اپنے پیروکاروں سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ معروف میں امیر کی اطاعت ان کے لیے لازم ہے، جس طرح اسلامی حکومت کے امیر کی اطاعت اس کی رعایا پر لازم ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا شریعت میں اس کی گنجائش ہے؟

جواب: مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک جماعت سازی یا امیر مقرر کرنا سہولت کار کے لیے ہیں۔ یہ فریضۂ دین نہیں۔ جن جماعتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ اس کو فریضۂ دین قرار دیتی ہیں۔ اب اسلامی مملکت کے امیر کی اطاعت سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا اور اس سے بغاوت جائز نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کے فہم حدیث کا تو یہ عالم ہے کہ جو حدیث اسلامی مملکت کے امیر کے لیے ہے وہ اس کو اپنی ذات پر چسپاں کر لیتے ہیں۔ حالانکہ "الجماعت" اور چیز ہے اور ان کی جماعت اور چیز۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقامت دین اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ نماز، زکوۃ وغیرہ؟

جواب: اقامتِ دین کا جو مطلب ہمارے ہاں بعض جماعتیں پیش کرتی ہیں، وہ ان کا خود ساختہ ہے۔ وہ اقامتِ دین سے اقامتِ نظام مراد لیتی ہیں۔ یہ اقامتِ دین کی غلط تعبیر ہے۔ اقامتِ دین سے مراد سارے شرعی نظام کو لوگوں کے اوپر نافذ کرنا نہیں۔ بلکہ دین کے اس بنیادی حصے کو پوری طرح اختیار کرنا ہے جو ہر شخص سے ہر حال میں مطلوب ہے اور جس کو اپنی زندگی میں پوری طرح شامل کر لینے کے بعد کوئی شخص خدا کی نظر میں مسلمان بنتا ہے۔ قرآن کی جس آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں وہاں "اقیموا الدین" سے مراد اساساتِ دین ہے، یعنی توحید اور آخرت، وغیرہ۔ تمام علما نے اس کی یہی تفسیر کی ہے اور اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔

سوال: مولانا، بعض علما کا خیال ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دین کا کام کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ پہلے سے موجود کسی جماعت میں شامل ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنی جماعت

قائم کرلے، تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں اس خیال سے متفق نہیں۔ کسی جماعت میں شمولیت کے بغیر بھی دین کا کام ہوسکتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس امر کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ فرائض دین میں شامل نہیں۔ یہ ان لوگوں کا خود ساختہ دینی فرض ہے۔ اپنی خود ساختہ تعبیروں کے لیے یہ خدا کے سامنے خود ہی جوابدہ ہوں گے۔

سوال: آپ جماعت اسلامی ہند میں طویل عرصہ تک شامل رہے ہیں۔ کیا جماعت اسلامی ہند اب بھی انہی بنیادوں پر کام کررہی ہے، جن بنیادوں پر تقسیم ہند سے قبل کررہی تھی؟

جواب: یہ ایک المناک کہانی ہے۔ جماعت اسلامی ہند فکری اور اعتقادی طور پر تو وہی ہے جو کہ پاکستان کی جماعت اسلامی ہے، لیکن اس کے لیے حالاتِ کار مختلف ہیں۔ جب میں جماعت اسلامی ہند میں تھا تو اس وقت قومی اور ملکی مسائل کو پروگرام میں شامل کرنا گناہ کے درجے میں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بین الاقوامی جماعت ہیں، ان کا نظریہ بین الاقوامی ہے اور یہ کہ ملی مسائل حقیقت میں کچھ نہیں۔ لیکن آج ان کی پوری تحریک ملی مسائل کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک آپ یہ اعلان نہ کریں کہ آپ نے اپنے سابقہ نظریہ کو خیرباد کہہ دیا ہے اس وقت تک ملی کے مسائل کے لیے تحریک چلانا آپ کے لیے مفید نہیں۔ یہ کیا کہ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح۔ لٹریچر میں لکھا ہوا ہے کہ تعلیم گاہیں قتل گاہیں ہیں۔ آج جماعت اسلامی کے لوگ اسکولوں میں پڑھ بھی رہے ہیں، ملازمتیں بھی کر رہے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں نے دوہرا معیار اختیار کر رکھا ہے۔ اور ڈبل سٹینڈرڈ اختیار کرکے آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ جماعت اسلامی ہند کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔

سوال: جماعت اسلامی پاکستان گزشتہ پینتالیس سال سے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ آپ کے خیال میں اب تک اس کو کتنی کامیابی حاصل ہوئی؟

جواب: جماعت اسلامی پاکستان، اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جو جدوجہد کررہی ہے، میں اس کو "اصولاً" صحیح سمجھتا ہوں۔ پاکستان ایک مسلم ملک ہے اور آزادی کے بعد اصولی طور پر وہاں کی آبادی کو یہ اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ وہ اپنے یہاں جس طریق زندگی اور جس نظام معاشرت کو چاہے رائج کرے۔ ایسی حالت میں پاکستان کی امت مسلمہ کا یہ فرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنے درمیان اسلامی نظام امارت قائم کرے۔ اس کے تحت زندگی کے تمام شعبوں کو اسلامی احکام اور قوانین کے مطابق منظم

کرے۔لیکن جماعت کے اس جد و جہد کے پیچھے جو فلسفہ ہے، وہ صحیح نہیں۔ مجھے امید نہیں کہ ان کی یہ جد و جہد کامیاب ہوگی۔اور اگر کامیاب ہو بھی گئی تو کردار کی کمزوری بہت جلد اس کو ناکامی میں بدل دے گی۔ پاکستان میں جماعت اسلامی کی حکومت کا وہی حشر ہوگا جو کیرلا میں کبھی کمیونسٹ وزارت کا ہوا تھا۔ پاکستان میں جماعت اسلامی کے طریق کار سے مجھے یہ اختلاف ہے کہ اس نے تدریج کار کا خیال نہیں رکھا۔ یہ تدریج کے اصول کے خلاف ہے کہ پہلے مرحلے میں ہی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ الٹا اہرام تعمیر کرنے کے مترادف ہے جو نہ کبھی بنا ہے اور نہ بن سکتا ہے؟

سوال: مولانا، آئے روز ہندستان سے فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں آتی رہتی ہیں۔آپ بتائیں گے کہ وہاں ان فسادات کا حقیقی سبب کیا ہے؟ اور یہ کہ وہاں کے مسلمانوں کے لیے نجات کی راہ کیا ہے؟

جواب: ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد دس بارہ کرور ہے۔تاریخ میں کوئی مثال نہیں کہ اتنی بڑی تعداد کو ظلم اور فساد کے ذریعے مٹا دیا گیا ہو۔اس کے برعکس، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے فساد مسلمانوں کی زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جہاں دبنے کے بعد زیادہ ابھرنے کا اصول رائج ہے۔ایسے لوگوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ قانونِ قدرت ان کی راہ میں رکاوٹ ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ تہذیبوں کو وجود میں لانے والی ہمیشہ وہ قومیں تھیں، جو شکست اور محرومی سے دوچار کی گئیں۔مثال کے طور پر مغرب کی مسیحی قوتیں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد جدید صنعتی تہذیب کی خالق بنیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو محرومی اور شکست میں مبتلا کر کے ان کے خاتمے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں جو قانونِ قدرت کے مطابق ان کے اندازوں کے سراسر خلاف، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔

سوال: سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب نجات کی راہ کیا ہے؟

جواب: ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سبب خواہ کچھ بھی ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ فسادات اگر بند ہوں گے تو صرف اس وقت ہوں گے جب مسلمان اپنے حصے کا فساد بند کر دیں گے۔ مسلمان اپنے حصے کا سبب ختم کر کے دوسروں کو آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے حصے کا سبب ختم کر دیں۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات صرف یک طرفہ کارروائی سے ختم ہو سکتے ہیں اور یہ یک طرفہ کارروائی بہر حال مسلمانوں کو کرنا ہوگی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں یک طرفہ طور پر راضی ہو کر قریش کی فساد انگیزیوں کا

سلسلہ ختم کروادیا۔اسی طرح ہمیں بھی یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو پابند بنانا ہے۔اگر ہم دوسرے فریق کی طرف سے بندش کی کارروائی کا انتظار کریں گے تو ایسا انتظار کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

سوال: مسلمان فسادات کو ختم کرنے کے لیے کیا کریں؟

جواب: مسلمان فساد کو ختم کرنے کے لیے یہ کریں کہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔تمام فسادات کا مشترک سبب یہ ہے کہ مسلمان اس راز کو نہیں جانتے کہ زندگی میں کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔اب جس چیز کو نظر انداز کرنا چاہیے اس پر مسلمان بھڑک اٹھتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ فساد ہے۔

پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سبب کیا ہے؟ کیوں کراچی میں فساد برپا ہوتا ہے؟ کیوں کوئٹہ میں شیعہ سنی تصادم ہوتا ہے؟ کیوں پنجابی سندھی ٹکراؤ ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ہر ماحول میں کچھ چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جن سے الجھنے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ان سے الجھنا ان کو اور بڑھانے کے ہم معنی ہے۔یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔اسی لیے قرآن میں صبر اور اعراض کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

نظر انداز کر دینے والی باتوں کو نظر انداز نہ کرنا وہ غلطی ہے جس میں ہندستان کے مسلمان بھی مبتلا ہیں اور پاکستان کے مسلمان بھی۔اس کی قیمت دونوں جگہ کے مسلمان شدید ترین صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ہندستان کے مسلمان فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں اس کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور پاکستان کے مسلمان غیر مستحکم سیاسی نظام کی صورت میں۔ہندستان کے مسلمانوں کے لیے فسادات کا واحد حل ”اعراض“ ہے۔مسلمان اس ”اعراض“ کو استعمال کریں گے تو ایک دن میں تمام فسادات بند ہو جائیں گے۔اگر مسلمان اس طریقہ پر راضی نہ ہوں گے تو موجودہ تدبیروں سے آئندہ پچاس سال تک بھی فسادات بند نہ ہوں گے، جس طرح گزشتہ پچاس سال میں اس قسم کی تدبیروں کے باوجود فسادات بند نہیں ہوئے۔

پھر یہ کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات پر جب کوئی مسلمان بات کرتا ہے تو وہ ہمیشہ ایک ہی چیز کی کوشش کرتا ہے کہ خالص قانونی اور منطقی جائزہ لے کر یہ دیکھتا ہے کہ کون سا فریق حق پر ہے اور کون ناحق پر۔یہ طریقہ سراسر غلط ہے، کیونکہ بعض امور وہ ہوتے ہیں، جن میں حق اور ناحق کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا عملی حل کیا ہے۔حدیبیہ کے مقام پر جب مسلمانوں اور قریش

کے درمیان صلح کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو آپ نے اس کا مضمون املا کراتے ہوئے کاتب سے کہا: لکھو یہ وہ ہے جس پر اللہ کے رسول نے صلح کیا (هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولَ اللّٰهِ)۔ قریش کے نمائندے نے کہا: ہرگز نہیں، اگر ہم آپ کو رسول مانتے تو جھگڑا کیا تھا۔ صرف محمد بن عبد اللہ لکھو۔ آپ نے فوراً کاتب سے کہا: محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ اگر آپ اس کو حق اور ناحق کا معاملہ بناتے تو کبھی اس معاملے کو ماننے پر رضامند نہ ہوتے، خواہ سارے مسلمان وہیں کٹ کر مر جاتے۔ مگر آپ نے عملی پہلو دیکھا۔ کیونکہ اس وقت عملاً اس کے سوا کوئی حل نہ تھا۔ اس لیے آپ محمد رسول اللہ کا لفظ چھوڑ کر صرف محمد بن عبد اللہ لکھنے پر راضی ہو گئے۔ (جاری)

آئیڈیل وزڈم، پریکٹکل وزڈم

پیغمبر اسلام ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر میں تھے۔ آپ کو یہ خبر ملی کہ راستے میں دوسری طرف سے مکہ کے خالد بن الولید آپ سے مقابلہ کرنے کے ارادے سے ایک مسلح دستہ لے کر آ رہے ہیں۔ اس وقت آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کون ہے جو ہم لوگوں کو کسی اور راستے سے لے جائے جس پر ان سے ٹکراؤ نہ ہو (مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلَى طَرِيقٍ غَيْرِ طَرِيقِهِمُ الَّتِي هُمْ بِهَا؟)۔ ایک آدمی نے کہا کہ میں۔ چنانچہ آپ نے اس وقت اپنے سفر کا راستہ بدل دیا (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 309)۔ اس کی وجہ سے آپ کے ساتھیوں اور خالد کے ساتھیوں میں مڈبھیڑ نہیں ہوئی، اور آپ وہاں پہنچ گئے جہاں آپ کو جانا تھا۔

اس طریقہ کو ایک لفظ میں پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے واقعات کہتے ہیں کہ آپ نے ہمیشہ ایسا کیا کہ آپ نے آئڈیل وزڈم کو چھوڑا، اور پریکٹکل وزڈم کو اختیار کیا۔ آپ کو اپنے مشن میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، اس کا سبب یقینی طور پر یہی پریکٹکل وزڈم ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ آئڈیل وزڈم نتیجہ کے اعتبار سے بے فائدہ ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس، پریکٹکل وزڈم غیر ضروری نقصان سے بچا کر کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔

قارئینِ الرسالہ

(الرسالہ مشن کا مقصد لوگوں کو خدا سے قریب کرنا، اور ان میں اعلیٰ سوچ پیدا کرنا ہے۔ الرسالہ اور الرسالہ مشن کی کتابوں کے مطالعہ سے لوگوں کی زندگی میں کس قسم تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس کی مثالیں روزانہ سامنے آتی رہتی ہیں۔ جو لوگ الرسالہ کا برابر مطالعہ کرتے ہیں ان میں معرفتِ خداوندی، سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ ذیل میں الرسالہ مشن کے قدیم وجدید قارئین کے کچھ تاثرات نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ الرسالہ کے موجودہ قارئین کو ان سے اپنے تزکیہ، معرفت اور دعوت کے لیے مزید تحریک مل سکے — ایڈیٹر)

نئی دہلی کے رام لیلا میدان میں اکتوبر 1984 ایک جلسہ ہوا۔ اس میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا تھا۔ اس موقع پر ایک رجسٹر بھی رکھا گیا تھا، جس میں بہت سے لوگوں نے اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ان میں سے ایک تبصرہ یہ ہے:

The 'Introduction to Islam Series' publications have been found useful, but it was observed that these are printed in English and Urdu languages only. With the viewpoint of the propagation of Islamic teachings all the useful handbooks or booklets should also be released in the rest of the modern Indian languages. On the whole, the rest of the publications displayed here are excellent and bearing the upto date information about Islam. Thanks for the endeavour in this regard. Chander Mohan, D-917, Netaji Nagar, New Delhi 23 (February 1985)

شری منگل سین اپنے خط (مورخہ 4 اپریل 1985) میں لکھتے ہیں: آپ کا ماہنامہ الرسالہ باقاعدگی سے دستیاب ہو رہا ہے۔ اور جب یہ پہنچتا ہے تو سارے کام چھوڑ کر اس پر جھپٹ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کسی سے بات چیت ہو رہی ہو تو فوراً ختم کر کے اس کو پڑھنا شروع کر کے تسکین ملتی ہے۔ بلا شبہ خدا نے آپ کے قلم میں وہ روانی عطا کی ہوئی ہے کہ جس سے ہمارے پاٹھکوں کو بہت آنند آتا ہے۔ گویا کہ یہ تحریر کسی خداشناس کی تحریر معلوم پڑتی ہے۔ (جولائی 1985)

ایک صاحب بمبئی سے لکھتے ہیں: الرسالہ میں ایک منفرد بات یہ ہے کہ اسے کسی بھی شخص کو خواہ وہ کسی بھی شعبہ کا ہو اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو دینے میں ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ بات کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔ ہمیں کوئی بھی پرچہ دینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے اور بہت سی جگہ نہ دینے پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ الرسالہ خدا کا خوف، حضور سے شدید محبت اور ایمان مضبوط کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ غصہ، تکبر، گھمنڈ کم ہوتا ہے اور آخرت کا ڈر اور اسلام کو پھیلانے کا احساس بڑھتا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب الرسالہ (انگریزی) پر نظر ڈالتے ہوئے خود بخود کہہ اٹھے، بے شک بے شک۔ آج کے دور میں کم خرچ، کم وقت اور زیادہ مناسب طریقہ پر ہم غیر مسلموں میں اسلام کو، "انگریزی" الرسالہ کے ذریعے ہی پیش کر سکتے ہیں۔ (نومبر 1985)

محبوب نگر سے ایک صاحب کا خط (12 اپریل 1985) موصول ہوا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے: میں حیدرآباد بذریعہ ٹرین جانے کی تیاری میں تھا کہ الرسالہ اپریل 1985 آپہنچا۔ میں نے سوچا کہ ڈھائی گھنٹے کے سفر کا ساتھی مل گیا۔ ٹرین چلتی رہی۔ میں الرسالہ میں محو تھا۔ یہاں تک کہ آخری مضمون شروع ہوا۔ رِقّت طاری ہوتی گئی، آنسو رواں ہو گئے۔ گرد و پیش کی کچھ خبر نہ رہی، یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں سفر میں ہوں میرے اطراف کم از کم چار چھ مسافر تو مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ مضمون ختم ہوا تو پاس میں بیٹھے ایک غیر مسلم معمر ہم سفر نے پوچھا کیا بات ہے بھائی، کوئی ٹریجڈی بھری کہانی پڑھ رہے تھے کیا۔ میں نے کہا نہیں یہ مذہبی پرچہ ہے۔ پھر میں نے ان کے کہنے پر مضمون کے بارے میں مختصراً بتاتے ہوئے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے جس سے وہ کافی متاثر ہو کر کہنے لگے جو تحریک ایثار اور قربانی پر چلتی ہے وہ ضرور کامیاب ہوتی ہے"۔ (دسمبر 1985)

ایک صاحب بنگلور سے (28 اکتوبر 1985 کے خط میں) لکھتے ہیں: میں کئی سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ اس سے پہلے میں حق کی پکڈنڈی پر چل رہا تھا، اب میں حق کی شاہراہ پر چلتے ہوئے مومن کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ مولانا کا انداز بیان میرے احساس میں ایسا اترتا ہے جیسے انھوں نے میرے دل کی باتوں ہی کی تصدیق کی ہے۔ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ مولانا صاحب سے مجھے بہت تقویت ملی ہے۔ (فروری 1986)

ذیل میں ایک جدید تعلیم یافتہ خاتون کا تاثر نقل کیا جارہا ہے:

From Atheism to Belief: "A few years ago, my father was an atheist. He had listened to conventional religious speakers and read various religious books, believing they all essentially conveyed the same messages, even the Quran. Hearing my father talk about conventional Islam daily, I, too, began to adopt his views.

However, he eventually started reading translations of the Quran in English and Bengali. After years of carefully studying the Quran, my father's beliefs shifted.

When I was living in the hostel, the religious teachers there imposed numerous restrictions on the girls—saying we couldn't do this or that, implying that girls weren't suitable for work outside the home and should remain within its boundaries. These limitations made me start resenting my religion. I wondered, if there is a Creator, why does such inequality exist between boys and girls?

A few months ago, a close friend introduced me to the works of Maulana Wahiduddin Khan. They said, 'Read Maulana Wahiduddin's books, and your perspective will change.' I have only read a little so far, but I already understand that what many so-called religious scholars have been saying differs from what the Quran actually conveys.

On October 14, a few members of Maulana Wahiduddin Khan's CPS (Centre for Peace and Spirituality) team visited our home. We discussed religious matters, as well as Maulana Wahiduddin Khan's works, writings, and philosophies. Hearing these discussions, many of my beliefs began to change. I realize now that understanding the Creator is complex, but I believe that by reading the Quran in a language I understand, I will find answers to my questions. I am truly happy to have been connected with the CPS team." (Ms. Tamanna Khatun, D/o A. H. Mondal, Nadia, West Bengal)

मुक़ाम कैसे मिला?

हम्ज़ा बिन अब्दुल मुत्तलिब पैग़म्बरे-इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के चचा थे। उनके बारे में इस्लामी इतिहास में लिखा गया है कि हज़रत हम्ज़ा उन लोगों में से थे, जिनके ज़रिए अल्लाह ने दीन को ताक़त दी (सीरत इब्ने कसीर, पहला भाग, पेज 446)। हज़रत हम्ज़ा को यह मुक़ाम ऐसे ही नहीं मिल गया, बल्कि वह उनके सच्चे अमल के नतीजे में उन्हें हासिल हुआ।

रसूलुल्लाह (स.अ.व.) को जब हुक्म हुआ कि अपने ख़ानदान के क़रीबी लोगों को आगाह करो (क़ुरान, 26:214) तो आपने ख़ास तौर पर हम्ज़ा के सामने दीने-तौहीद पेश किया, मगर उनके ज़ेहन पर बाप-दादा के दीन का इतना असर था कि शुरू में कई साल तक इस्लाम की सच्चाई उनकी समझ में न आ सकी। आख़िरकार नबूवत के छटे साल उन्होंने इस्लाम क़बूल किया।

एक रोज़ वह शिकार खेल कर वापस आए। उनके हाथ में लोहे की कमान थी। ठीक उसी वक़्त एक औरत ने आकर उनसे कहा कि अभी मैंने सफ़ा पहाड़ी के पास मुहम्मद को देखा है। वहां अम्र बिन हिशाम (अबू जहल) भी था और वह तुम्हारे भतीजे को गाली दे रहा था और बहुत ज़्यादा बुरा कह रहा था। हम्ज़ा ख़ानदानी ग़ैरत के तहत घर से निकले, काबे में उन्होंने अबू जहल को पा लिया। वह अभी तक ग़ुस्से में थे। उन्होंने लोहे की कमान अबू जहल के सिर पर इतने ज़ोर से मारी कि ख़ून निकल आया। उन्होंने अबू जहल से कहा कि तुम मेरे भतीजे के दुश्मन बने हुए हो, तो सुन लो कि मेरा दीन भी वही है जो मुहम्मद का दीन है। अबू जहल का ताल्लुक़ क़बीला बनू मख़्ज़ूम से था और हम्ज़ा का ताल्लुक़ क़बीला बनू हाशिम से।

घर वापस आए तो क़ौम के कुछ लोग उनसे मिले। उन्होंने हम्ज़ा को शर्म दिलाई कि तुम विधर्मी हो गए। तुमने अपने बाप-दादा के तरीक़े को छोड़ दिया। एक भतीजे की ख़ातिर तुम क़ौम के तमाम पेशवाओं से कट गए, वग़ैरह। इस तरह की बातों से हम्ज़ा

ज़ेहनी कशमकश में पड़ गए। उन्हें शक होने लगा कि शायद मैंने ख़ानदानी हिमायत के जोश में आकर ग़लती कर दी है। वह रात भर बेचैन रहे। उन्हें सारी रात नींद नहीं आई। सुबह हुई तो इसी बेचैनी में काबा में गए। वहां अल्लाह से उन्होंने दुआ कीः

> मैंने जो कुछ किया, ऐ अल्लाह, अगर वह हिदायत है तो उसकी तस्दीक़ मेरे दिल में डाल दे। वरना मैं जिस में पड़ गया हूं उससे मेरे लिए निकलने की सूरत पैदा कर दे (सीरत इब्ने कसीर, पहला भाग, पेज 446)।

इसी के साथ अगले दिन वह रसूलुल्लाह (स.अ.व.) से मिले। उन्होंने आप से कहा कि मेरे भतीजे, मैं एक मामले में पड़ गया हूं। और उससे निकलने की सूरत मुझे नज़र नहीं आती। मुझे यह भी नहीं मामूल कि यह सही रास्ता है या गुमराही है। इसलिए आप इस मामले में मुझे बताइए। ऐ भतीजे, मैं तुमसे इस मामले में सुनना चाहता हूं। रसूलुल्लाह (स.अ.व.) ने उनको नसीहत की। उन्हें ख़ौफ़ दिलाया और उनको अल्लाह के इनाम की ख़ुशख़बरी दी। इसके बाद अल्लाह ने उनके दिल में यक़ीन डाल दिया। उन्होंने कहा कि मैं गवाही देता हूं कि आप सच्चे हैं। ऐ मेरे भतीजे, अपने दीन का आम ऐलान करो। ख़ुदा की क़सम, अगर मुझे वह सब कुछ दिया जाए जिस पर आसमान ने साया किया है, तब भी मैं इस दीन को नहीं छोड़ूंगा (पेज 446)।

इसके बाद हज़रत हम्ज़ा पूरी तरह आप के साथी बन गए। जाहिलीयत (इस्लाम से पहले) के ज़माने में वह एक दौलतमन्द शख़्स थे। इस्लाम में आने के बाद उनकी दौलत ख़त्म हो गई। उन्हें अपने वतन मक्का को छोड़ कर मदीना जाना पड़ा। इस्लाम की ख़ातिर उन्हें अपनी क़ौम से लड़ाई लड़नी पड़ी। फिर भी आख़िर तक वह पूरी वफ़ादारी के साथ रसूलुल्लाह (स.अ.व.) के साथ रहे। यहां तक कि उहुद की जंग में वह शहीद हो गए।

यह वह बड़ी ख़ुशक़िस्मती है जो हज़रत हम्ज़ा को हासिल हुई। फिर भी यह सौभाग्य उन्हें सादा तौर पर नहीं मिल गया। उन्होंने अपने ग़ैरत के जज़्बात को ख़ुदा के दीन के लिए इस्तेमाल किया। जब शैतान ने उनके अन्दर शक पैदा किया तो उन्होंने उस

शक को क़बूल नहीं कर लिया, बल्कि उसके लिए रो-रो कर दुआएं कीं। रसूलुल्लाह (स.अ.व.) से मिल कर उसकी सफ़ाई मालूम की। और जब बात साफ़ हो गई तो फिर कोई चीज़ उनके लिए स्वीकार करने में रुकावट नहीं बनी। उन्होंने न सिर्फ़ खुले दिल से उसे स्वीकार किया, बल्कि हर नुक़सान और मुसीबत को बर्दाश्त करते हुए बराबर उस पर क़ायम रहे।

यह है हज़रत हम्ज़ा की वह क़ुर्बानी, जिसके नतीजे में सारी दुनिया के मुसलमान हर हफ़्ते जुमा' के ख़ुतबे में 'सैयदुश्शुह्दा हम्ज़ा' कह कर उनकी दीनी बड़ाई का एतिराफ़ करते हैं।

बोलने का तरीक़ा

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का बोलने का तरीक़ा यह था कि आप हमेशा साफ़ अन्दाज़ में बोलते थे और अल्फ़ाज़ को ठहर-ठहर कर अदा करते थे। आपकी अहलिया हज़रत आयशा रज़ी अल्लाहु अन्हा ने बाद के ज़माने के लोगों से फरमायाः

> रसूलुल्लाह (स.अ.व.) तुम लोगों की तरह तेज़-तेज़ नहीं बोलते थे, बल्कि आपके कलाम में ठहराव होता था। आप के पास बैठा हुआ आदमी उसको याद कर लेता था (सुनन अल-तिरमिधि, हदीस संख्या 3639)।

एक और रिवायत में ये अल्फ़ाज़ आए हैं:

> रसूलुल्लाह (स.अ.व.) इस तरह तेज़-तेज़ बातें नहीं करते थे जैसे तुम करते हो, आप इस तरह बात करते थे कि अगर गिनने वाला गिने तो उसको गिन ले। (सही अल-बुख़ारी, हदीस न. 3567)

मोमिन का बोलना एक ऐसे शख़्स का बोलना होता है जो अल्लाह से डरने वाला हो। मोमिन को यक़ीन होता है कि उसका हर लफ़्ज़ फ़रिश्ते लिख रहे हैं। वह अपनी कही हर बात के लिए ख़ुदा के यहां जवाबदेह होने वाला है। मोमिन का यह यक़ीन

उसके अन्दर ज़िम्मेदारी का एहसास पैदा कर देता है। वह जब बोलता है तो उसको ऐसा महसूस होता है जैसे वह ख़ुदा और फ़रिश्ते के सामने बोल रहा है। यह एहसास उसकी ज़ुबान पर लगाम लगा देता है। वह बोलने से पहले सोचता है। वह जब बोलता है तो अल्फ़ाज़ तोल कर अपने मुंह से निकालता है। ख़ुदा का ख़ौफ़ उससे तेज़कलामी का अन्दाज़ छीन लेता है। आख़िरत की जवाबदेही का एहसास उसके बोलने के जोश के लिए रुकावट बन जाता है।

जो शख़्स इस क़िस्म के सख़्त एहसासों से दबा हुआ हो वह आख़िरी हद तक संजीदा इन्सान बन जाता है। और संजीदा इन्सान की बातचीत का अन्दाज़ वही होता है, जिसका नक़्शा हज़रत आयशा की ऊपर वाली रिवायत में नज़र आता है।

बोलने की सूझबूझ

रसूलुल्लाह सल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमाया कि जो शख़्स अल्लाह पर और आख़िरत के दिन पर ईमान रखता हो उसको चाहिए कि बोले तो भली बात बोले वरना चुप रहे।

ला ब्रूइयर (Jean de La Bruyere) एक फ्रांसिसी लेखक है। वह 1645 में पैदा हुआ और 1696 में उसकी मृत्यु हुई। उसने यही बात इन शब्दों में कही कि यह बड़ी बदक़िस्मती की बात है कि आदमी के अन्दर न इतनी समझ हो कि वह अच्छा बोले और न इतनी निर्णय-शक्ति हो कि वह चुप रहे:

> It is a great misery not to have enough wit to speak well, nor enough judgement to keep quiet.

बोलने की क्षमता एक महान् क्षमता है, जो अल्लाह तआला ने इन्सान को दी है। बोलने की क्षमता को अगर सही तौर पर इस्तेमाल किया जाए तो वह नेमत है और अगर बोलने की क्षमता का बेजा इस्तेमाल किया जाए तो वह उतनी ही बड़ी मुसीबत बन जाती है।

बोलने की क्षमता का सही इस्तेमाल यह है कि आदमी बोलने से पहले सोचे। ख़ुद

कहने से पहले वह दूसरों की सुने। जो शब्द भी वह मुंह से निकाले यह सोच कर निकाले कि उसको अपने बोले हुए एक-एक शब्द का जवाब अल्लाह तआला के यहां देना है। जिसके पास बोलने के लिए हो उसके बावजूद वह चुप रहने को पसन्द करे। जो ज़िम्मेदारी के एहसास के तहत बोले न कि बोलने के शौक़ के तहत।

इसके विपरीत बोलने की क्षमता का ग़लत इस्तेमा'माल यह है कि आदमी सोचे बग़ैर बोले; उसको सिर्फ़ सुनाने का शौक़ हो; सुनने से उसको कोई दिलचस्पी न हो; मामले को गहराई के साथ समझे बग़ैर मामले पर भाषण झाड़ने के लिए खड़ा हो जाए; उसका बोलना दिखावे के लिए हो न कि सच्चाई प्रकट करने के लिए।

बोलना सबसे बड़ा सवाब (पुण्य) है और बोलना सबसे बड़ा गुनाह भी। जो आदमी इस हक़ीक़त को जान ले, उसका बोलना भी सार्थक होगा और उसका चुप रहना भी सार्थक।

ज़ुबान और दिल सबसे अच्छे भी हैं और सबसे ख़राब भी

लुक़मान हकीम एक हब्शी ग़ुलाम थे। उनके आक़ा ने एक रोज़ उनसे कहा कि एक बकरी ज़िब्ह करो और उसमें से दो बेहतरीन गोश्त के टुकड़े निकालो। लुकमान ने बकरी ज़िबह की और ज़ुबान और दिल निकाल कर आक़ा के सामने पेश किया। कुछ दिन के बाद आक़ा ने दोबारा कहा कि एक बकरी जिब्ह करो और उसमें से दो सबसे ज़्यादा ख़राब गोश्त के टुकड़े निकालो। लुकमान ने बकरी ज़िब्ह की और दोबारा ज़ुबान और दिल निकाल कर आक़ा के सामने रख दिए। आक़ा ने कहा कि मैंने तुम से दो सबसे अच्छे टुकड़े निकालने के लिए कहा तो तुमने ज़ुबान और दिल निकाले और जब मैंने तुम से दो सबसे ख़राब टुकड़े निकालने के लिए कहा तब भी तुमने ज़ुबान और दिल निकाले। ऐसा क्यों? लुकमान हकीम ने जवाब दियाः अगर ये दोनों दुरुस्त हों तो इनसे बेहतर कोई चीज़ नहीं, और अगर ये दोनों बिगड़ जाएं तो इनसे ज़्यादा ख़राब कोई चीज़ नहीं।

ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब

इन्सान इन्क़िलाब चाहता है। उसी के साथ वह चाहता है कि यह इन्क़िलाब ग़ैर-ख़ूनी तौर पर आए। मगर इतिहास बताता है कि कोई भी शख़्स ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने में कामयाब न हो सका। तमाम मालूम इन्क़िलाब क़त्ल और ख़ून के जंगल को पार करके ही आए हैं। मुहम्मद सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम का लाया हुआ इन्क़िलाब तमाम मालूम इतिहास का अकेला इन्क़िलाब है जो सही मानो में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब (bloodless revolution) है। मुहम्मद (स.अ.व.) को अगर इतिहास से हटा दिया जाए तो न सिर्फ़ ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब की यह बात अफ़साना बन कर रह जाती है, बल्कि उसके बाद कोई ऐसी व्यावहारिक मिसाल बाक़ी नहीं रहती जिसकी रोशनी में कोई इन्सान बाद के ज़मानों में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब की बात सोच सके।

फ्रान्स में आधुनिक लोकतांत्रिक इन्क़िलाब आया। इसमें जनता और राजतंत्र के बीच जो मुक़ाबले हुए उनमें मरने वालों की तादाद 10 लाख तक पहुंच गई। बीसवीं सदी में रूस में कम्यूनिस्ट इन्क़िलाब आया। उसमें जो लोग मरे और मारे गए उनकी ठीक-ठीक तादाद मालूम नहीं। फिर भी अन्दाज़ा है कि उनकी तादाद किसी हाल में एक करोड़ से कम नहीं। अमरीकी इन्क़िलाब (1773-1783) में इससे कुछ कम आदमी मरे। फिर भी इसमें मरने वालों की तादाद 50 हज़ार तक पहुंच गई। विश्व युद्धों का मामला इससे भी आगे है। पहले विश्व-युद्ध में विभिन्न मुल्कों के 75 लाख आदमी मारे गए। और दूसरे विश्व-युद्ध में छः करोड़ से ज़्यादा आदमी मरे।

मुहम्मद (स.अ.व.) इस दुनिया से गए तो एक पूरे मुल्क में ज़बरदस्त वैचारिक और नैतिक इन्क़िलाब आ चुका था। आपकी वफ़ात के वक़्त 12 लाख वर्ग मील के क्षेत्र पर आपकी हुकूमत क़ायम थी। मगर इस पूरी प्रक्रिया में सिर्फ़ 1018 आदमी मरे, जिनमें 259 मुसलमान थे और 759 ग़ैरमुस्लिम। यह तादाद घटना को देखते हुए इतनी कम है कि वह लगभग नहीं के बराबर है। आपके लाए हुए इन्क़िलाब को बेशक पूरे मा'नों में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़ालाब कहा जा सकता है।

हर लीडर ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने का दावा करता है। मगर कोई लीडर ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िालाब लाने में कामयाब नहीं होता। इसकी वजह क्या है? इसकी वजह यह है कि दुनिया में ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने के लिए ख़ुद अपने आपका ख़ून करना पड़ता है। और यही वह क़ीमत है जिसके देने के लिए कोई शख़्स तैयार नहीं ख़ूनी इन्क़िलाब टकराव की ज़मीन पर आते हैं और ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब सब्र और संयम की ज़मीन पर और सब्र से ज़्यादा मुश्किल कोई काम इस दुनिया में एक इन्सान के लिए नहीं।

सब्र की हक़ीक़त झटके को अपने पर लेना है, दूसरे पर डालने के बजाए अपने आप पर सहना है। हक़ीक़त यह है कि लड़ाई के बग़ैर भी जीत होती है। मगर लड़ाई के बग़ैर जीतने के लिए अपने आप से लड़ना पड़ता है। लोग अपने आप से लड़ नहीं पाते, इसलिए वे लड़ाई के बग़ैर लड़ाई जीतने वाले भी नहीं बनते।

मुहम्मद (स.अ.व.) ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने में किस तरह कमियाब हुए, इसका अन्दाज़ा आपकी ज़िन्दगी के हालात को पढ़ने से होता है। मक्का में 13 साल तक आपके विरोधियों ने आपको और आपके साथियों को हर तरह की तकलीफ़े पहुंचाई। उन्होंने अल्फ़ाज़ की चोट भी दी और पत्थर और तलवार की चोट भी। मगर इस तरह की बेशुमार घटनाओ के बावजूद मुहम्मद (स.अ.व.) ने एक बार भी जवाबी प्रतिक्रिया नहीं की। न किसी से कोई लड़ाई की। आप विरोधियों के हर वार को एकतरफ़ा तौर पर सहते रहे। उनकी तरफ़ से हर क़िस्म के भड़काव के बावजूद कभी भड़के नहीं।

इसके बाद आपने यह किया कि मक्का को छोड़ कर ख़ामोशी के साथ मदीना चले गए। आपने न इसके ख़िलाफ़ फ़रियाद की कि आपको आपके साथियों को अपने वतन और अपनी जायदाद को छोड़ना पड़ रहा है और न इसकी परवा की कि इस तरह वतन छोड़ कर जाने की वजह से लोग आप पर बुज़दिली और फ़रार का इलज़ाम लगाएंगे।

मदीना चले जाने के बाद मक्का के लोगों ने आपके ख़िलाफ़ जंग छेड़ दी। उस वक़्त

भी आपकी पालिसी यह रही कि जहां तक हो सके जंग से बचा जाए। मिसाल के तौर पर एहज़ाब के मौक़े पर आपने खाई खोद कर अपने और अपने दुश्मनों के बीच आड़ क़ायम कर दी। आपने सिर्फ़ बचाव (डिफेंस) में जंग की और वह भी उस वक़्त जबकि मुठभेड़ के सिवा कोई और सूरत बाक़ी न रह गई हो। ऐसी बाक़ायदा जंगे सिर्फ़ तीन हैं जिनमें आप ख़ुद शरीक रहे हों (बद्र, उहुद और हुनैन)। आपके ज़माने में मू'ता की जंग भी हुई मगर उसमें आप ख़ुद शामिल न थे।

आपको अरब में जो ताक़त हासिल हुई वह जंग के ज़रिए नहीं हुई। बल्कि उस सुलह के ज़रिए हुई, जिसको क़ुरआन में फ़त्ह-मुबीन (48:1) यानी खुली-जीत कहा गया है। सुलह-हुदैबिया का वाक़िआ ग़ैर-ख़ूनी इन्क़िलाब लाने के लिए अपने आपका ख़ून करने से कम न था। आपने अपनी ज़ात का 'ख़ून' करना गवारा किया ताकि बाहर की दुनिया में ख़ून न बहाया जाए।

पैग़म्बरे इस्लाम (स.अ.व.) को अरब में जो ताक़त हासिल हुई वह जंग के ज़रिए नहीं बल्कि दावत के ज़रिए हासिल हुई। इसी दावत के बन्द दरवाज़ों को खोलने के लिए आपने यह किया कि दुश्मन से उसकी अपनी शर्तों पर सुलह कर ली। यह सुलह हुदैबिया थी जिसको क़ुरआन में खुली फ़त्ह कहा गया है। सुलह हुदैबिया इस बात का एक ऐतिहासिक सबूत है कि जंग के मुक़ाबले में अमन की ताक़त बहुत ज़्यादा है। रसूलुल्लाह (स.अ.व.) ने हुदैबिया की एकतरफ़ा सुलह के ज़रिए इसी महान हक़ीक़त का अमली रूप दिखाया है, फिर भी यह कोई सादा बात नहीं। इस क़िस्म की एक घटना को अमली रूप देने के लिए सब्र की ज़रूरत है, और इस दुनिया में बेशक सब्र से ज़्यादा मुश्किल क़ुरबानी और कोई नहीं।

मेयार को बुलन्द करना

पुराने ज़माने के अरब में बराबर की अख़्लाक़ियात (नैतिकता) का रिवाज था। उनकी ज़िन्दगी का उसूल यह था कि जो शख़्स जैसा करे उसके साथ वैसा ही किया जाए।

यानी अच्छा सुलूक करने वाले के साथ अच्छा सुलूक और बुरा सुलूक करने वाले के साथ बुरा सुलूक। इस्लाम से पहले के ज़माने का एक शायर अपने मुक़ाबिले के क़बीले के बारे में कहता है कि ज़्यादती की कोई क़िस्म हमने बाक़ी नहीं छोड़ी। उन्होंने हमारे साथ जैसा किया था वैसा ही हमने उनको बदला दिया।

रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने अख़्लाक़ के इस उसूल को बदला। बराबरी के अख़्लाक़ के बजाय आपने उनको बुलन्द अख़्लाक़ी की तालीम दी। आपने फ़रमाया कि "जो शख़्स तुम्हारे साथ बुरा सुलूक करे उसके साथ तुम अच्छा सुलूक करो।" (कंज़ुल उम्माल, हदीस न. 6929)

एक और हदीस में है:

> तुम लोग इम्मआ (मौक़ापस्त-ख़ुदगर्ज़) न बनो, कि यह कहने लगो कि अगर लोग हमारे साथ अच्छा करें तो हम भी उनके साथ अच्छा करेंगे। और अगर वे ज़्यादती करें तो हम भी ज़्यादती करेंगे। बल्कि अपने आपको इसके लिए तैयार करो कि लोग तुम्हारे साथ अच्छा करें तो तुम उनके साथ अच्छा करोगे और अगर लोग तुम्हारे साथ बुरा करें तब भी तुम उनके साथ ज़्यादती नहीं करोगे। (सुनन अल-तिर्मिज़ी, हदीस न. 2007)

आपकी एक सुन्नत यह भी है कि लोगों के शुऊर (चेतना) को बुलन्द किया जाए। उनके अख़्लाक़ को ऊंचा किया जाए। उनकी ज़ेहनी हालत को हर लिहाज़ से ऊपर उठाने की कोशिश की जाए।

इन्सान के इन्सानी मे'यार को बुलन्द करना, फ़िक्री, इल्मी, अख़्लाक़ी हैसियत से उसको ऊपर उठाना अहमतरीन काम है। इसमें आदमी की भलाई है और इसी में पूरे समाज की भलाई भी। यह ठीक रसूल का तरीक़ा है यानी सुन्नते रसूल है और इसको ज़िन्दा करना सुन्नते-रसूल को ज़िन्दा करना है।

एक हदीस

हदीस की किताबों में आख़िरी दौर के बारे में बहुत सी पेशीनगोइयां यानी भविष्यवाणियां की गई हैं। उन्हीं में से एक पेशीनगोई वह है जिसको इमाम अहमद और दूसरे हदीसकारों ने नक़्ल किया है :

> हज़रत मिक़्दाद कहते हैं कि उन्होंने रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम को यह कहते हुए सुना कि ज़मीन की सतह पर कोई ख़ेमा या घर बाक़ी न रहेगा, मगर यह कि अल्लाह उसमें इस्लाम के कलिमे को दाख़िल कर देगा, चाहे अज़ीज़ की इज़्ज़त के साथ या ज़लील की ज़िल्लत के साथ। अल्लाह या तो उन्हें इज़्ज़त देगा और उनको इस्लाम वालों में से बना देगा या उन्हें ज़लील करेगा तो वे उसके दीन को इख़्तियार कर लेंगे। (मुसनद अहमद, हदीस न. 23814)

यह हदीस बताती है कि आख़िरी ज़माने में इस्लाम हर घर में दाख़िल हो जाएगा। मगर हदीस के अल्फ़ाज़ के मुताबिक़ जो चीज़ घरों के अन्दर दाख़िल होगी वह इस्लाम का कलिमा होगा न कि इस्लाम का सियासी और हुकूमती इक़्तिदार (सत्ता)। कुछ लोगों ने इस पेशेनगोई को सियासी दाख़िले के मानों में ले लिया है इसका नतीजा यह है कि वे लोग सारी दुनिया में इस्लाम का सियासी झंडा लहराने के नाम पर मदऊ (निमंत्रणीय) क़ौमों से सियासी लड़ाई छेड़े हुए हैं। इस बेकार की लड़ाई का नतीजा यह है कि ये लोग इस्लाम से बेज़ार होकर उससे दूर होते जा रहे हैं।

इस पेशेनगोई को सच्चाई बनाने के लिए मुसलमानों को जो काम करना है वह अल्लाह की दा'वत है। उन्हें चाहिए कि वे तौहीद और आख़िरत के रब्बानी पैग़ाम से तमाम क़ौमों को बाख़बर करने में दिलो-जान से लग जाएं, वे इस्लाम को फ़िक्री और बौद्धिक हैसियत से एक मालूम और सम्पूर्ण चीज़ बना दें, ताकि जिसको मानना है वह माने, और जिसको नहीं मानना उस पर दलील क़ायम हो जाए। यानी उनको आख़िरी हद तक अल्लाह का पैग़ाम पहुंचा दिया जाए ताकि उनके पास कोई बहाना बाक़ी न रहे कि उन तक सच्चाई नहीं पहुंची।

बोलने वाला नबी

एक आलिम का कहना है कि जिस आदमी के घर में चन्द हदीसें हैं तो यह ऐसा है जैसे उस घर के अंदर बात करते हुए खुद नबी मौजूद हैं। (जामि' अल-उसूल, इबन अल-असीर, भाग 1, पेज 194)

यह बात वैसे तो एक सादा सी बात है, लेकिन है बहुत अहम। आज इन्सान के पास सिर्फ़ पैग़म्बरे-इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ही का कलाम नहीं है, बल्कि दूसरे पैग़म्बरों का कलाम भी मौजूद है। मसलन तौरात और इंजील में बहुत से नबियों के कलाम मौजूद हैं, मगर इन किताबों के बारे में नहीं कहा जा सकता कि जिस घर में ये किताबें हैं, उस घर में अंबिया बात करते हुए मौजूद हैं, जबकि पैग़म्बरे इस्लाम के बारे में यह बात बिल्कुल लफ़्ज़ी तौर पर दुरुस्त है।

इस फ़र्क़ की वजह यह है कि दूसरे पैग़म्बरों का जो कलाम आज मज़हबी किताबों में मौजूद है वह भरोसे के लायक़ नहीं है। उनमें मिलावट और नक़्ल के नतीजे में बहुत-सी तब्दीलियां हो चुकी हैं। इस तरह वैसे तो पैग़म्बर का कलाम मौजूद है लेकिन वह इस रूप में नहीं है कि उन पर भरोसा किया जा सके।

जबकि पैग़म्बर-इस्लाम (स.अ.व.) का मामला बिल्कुल अलग है। आपका कलाम पूरी तरह पैग़म्बर का कलाम है। आपके कलाम के संकलन और सम्पादन में इतनी ज़्यादा मेहनत और एहतियात की गई है और उसकी शुद्धता और स्वस्थता का इतना ज़्यादा ध्यान रखा गया है कि आज जो 'हदीस का संग्रह' हमारे पास मौजूद है, उसके बारे में पूरे भरोसे के साथ कहा जा सकता है कि वे पैग़म्बर के शब्द हैं।

इस तरह पैग़म्बरे इस्लाम जैसे हमेशा के लिए हमारे बीच में मौजूद हैं। वह इन हदीसों के ज़रिए बराबर हम से बात करते हैं। वह हमको हिदायत दे रहे हैं। वह हर मौक़े पर हमारी रहनुमाई कर रहे हैं। वह हर अंधेरे में हमको रोशनी दिखा रहे हैं।

लेकिन यह बोलने वाला रसूल सिर्फ़ उस आदमी के लिए है जो अपने अन्दर सुनने

वाला कान रखता हो। जिस आदमी के पास सुनने वाले कान न हों, उसके घर में बोलने वाला रसूल तो होगा, लेकिन वह उसकी आवाज़ न सुन सकेगा। वह उसी तरह अन्धा-बहरा बना रहेगा जिस तरह पैग़म्बर के ज़माने में बहुत से लोग उसकी बात को सुनने और समझने के लिए अन्धे और बहरे बने रहे। वह इन्सान भी कैसा बदनसीब और महरूम इन्सान है जिसके पास बोलने वाला नबी मौजूद हो लेकिन वह उसे सुनने वाला न बन सके।

मुश्किल में आसानी

क्या हमने तुम्हारा सीना तुम्हारे लिए खोल नहीं दिया। और तुम्हारा वह बोझ उतार दिया जो तुम्हारी पीठ को तोड़ रहा था। और हमने तुम्हारा ज़िक्र बुलन्द किया। तो मुश्किल के साथ आसानी है, बेशक मुश्किल के साथ आसानी है। फिर जब तुम मुक्त हो जाओ तो मेहनत करो। और अपने रब की तरफ़ ध्यान लगाओ। (सूरह अल-इन्शिराह)।

यह सूरह मक्का के शुरू के ज़माने में उतरी। रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने मक्का में जब लोगों को एकेश्वरवाद (तौहीद) की तरफ़ बुलाना शुरू किया तो यह उन तमाम लोगों को अविश्वसनीय ठहराने के बराबर था, जो अल्लाह के सिवा दूसरे खुदाओं के आधार पर बड़ाई और सरदारी का दर्जा पाए हुए थे। इसलिए ये लोग आपके सख़्त दुश्मन हो गए। वे आपको तरह-तरह की तकलीफ़ें पहुंचाने लगे। आप सख़्त परेशानी में पड़ गए।

उस वक़्त इस सूरह के ज़रिए आपको अल्लाह की एक सुन्नत से बाख़बर किया गया। वह यह कि इस दुनिया में 'मुश्किल' का रिश्ता 'आसानी' से बंधा हुआ है। इस दुनिया में मुश्किल का आना किसी नई आसानी की भूमिका होता है, बशर्ते कि आदमी हौसला न खोए और आने वाले बेहतर कल का इंतेज़ार कर सके।

रसूलुल्लाह (स.अ.व.) नुबूवत से पहले सच्चाई की तलाश में सख़्त परेशान और प्रयत्नशील रहे। उस वक़्त के माहौल और मज़हब में आपको इत्मीनान नहीं मिल रहा था। 'सच्चाई क्या है' इस सवाल ने आपकी रातों की नींद और दिन का सुकून ख़त्म कर दिया। यह परेशानी हालांकि शुरू की 'मुश्किल' थी, लेकिन इसके अन्दर 'आसानी' का पहलू निकल आया। क्योंकि इसने आपको ख़ुश्क ज़मीन की तरह बना दिया, ताकि जब 'वह्य' की सूरत में हिदायत आए तो उसकी एक-एक बूंद आपके अन्दर जज़्ब होती चली जाए। आप भरपूर तौर पर उसे ग्रहण कर लें। वह पूरी तरह आपके ज़ेहन को साफ़ और रोशन कर दे।

दूसरी चीज़ जो इस 'सुन्नत' के लिए बतौर मिसाल पेश की गई, वह ज़िक्र को बुलन्द करने का मामला है। रसूलुल्लाह (स.अ.व.) की के लोगों को ईश्वर के सृष्टि-निर्माण योजना से अवगत करने की वजह से जिन लोगों को विरोध पैदा हुआ उन्होंने इसको नाकाम करने के लिए उनको बदनाम करने की मुहिम शुरू कर दी। वे आपके ख़िलाफ़ अशआर (कविता) कह कर उसको फैलाते, जो एक तरह से उस ज़माने की पत्रकारिता थी। मेले और बाज़ार, जो उस ज़माने के इज्तिमा थे, वहां जाकर वे लोगों को आपके ख़िलाफ़ भड़काते। वे लोगों के सामने आपकी बुरी तस्वीर पेश करते ताकि वे आपसे और आपके सच्चे मिशन से बदगुमान हो जाएं।

विरोधियों ने ऐब निकालने और इल्ज़ाम लगाने की जो मुहिम चलाई, उसका मक़्सद उनके अपने ख़्याल के मुताबिक़ यह था कि पैग़म्बर को बदनाम करें और इस तरह लोगों को ईश्वर के सृष्टि-निर्माण योजना को समझने से दूर कर दें, उससे डरा दें। मगर इस मुश्किल में भी आसानी का पहलू निकल आया। विरोधी अपने तौर पर तो आपको बदनाम करने की कोशिश कर रहे थे, पर दूसरों के लिए इसमें उत्सुकता पैदा हो गई। इस तरह आपकी शख़्सियत लोगों के सामने एक बड़ा सवाल बन कर खड़ी हो गई। हर आदमी में यह जानने की बेचैनी और जिज्ञासा पैदा हो गई कि मुहम्मद कौन है और उनका पैग़ाम क्या है? आखिर वह कहते क्या हैं?

इन्सानी स्वभाव है कि वह कभी अधूरी और आंशिक जानकारी से संतुष्ट नहीं होता। वह हमेशा पूरी बात जानना चाहता है। लिहाज़ा आपके ख़िलाफ़ कुछ बातें सुन कर लोग उतने ही पर रुक नहीं जाते थे, बल्कि वे पैग़ाम और पैग़ाम पेश करने वाले के बारे में और ज़्यादा जानकारी हासिल करने के लिए ख़ुद खोजबीन करते थे। वे आपसे मिलते और क़ुरआन को पढ़ते-सुनते। इस तरह विरोध का यह नतीजा हुआ कि आपका पैग़ाम दूर-दूर तक पहुंच गया, जहां आप ख़ुद अभी तक उसको नहीं पहुंचा सके थे। विरोधियों ने आपको बदनाम करके आपके बारे में लोगों के अन्दर खोज-बीन करने का शौक़ पैदा किया। और जब उन लोगों ने सीधे ख़ुद खोज-बीन की तो उनमें से बहुत से लोग आपके पैग़ाम को हक़ व सच्चा पाकर उसके हामी बन गए।

इस सूरह में रसूलुल्लाह (स.अ.व.) से कहा गया है कि 'मुश्किल' के 'आसानी' में तब्दील होने के दो तजुर्बे तो तुम कर चुके हो - सच की तलाश की बेचैनी के बाद हिदायत का मिलना, बदनामी की मुहिम से दावत फैलने के नए मौक़े पैदा होना। इसी तरह उस सुन्नते-इलाही का तीसरा पहलू भी जल्द ही तुम्हारे सामने आ जाएगा। हालात की स्वाभाविक रफ़्तार को अपनी हद तक पहुंचाने दो और भविष्य के उजागर होने तक सब्र के साथ उसका इंतज़ार करो।

इस तीसरे दौर का मतलब पैग़ाम और पैग़ाम पेश करने वाले का शुरुआती दौर से निकल कर मुसल्लमा (सम्पूर्ण) दौर में दाख़िल होना है। जिसको सूरह नस्र में 'फ़त्ह' कहा गया है। मौजूदा शुरुआती दौर में जो सख़्त हालात पेश आ रहे हैं, वे आने वाली 'आसानी' की भूमिका हैं। इस तरह वे तमाम ज़रूरी कारक (फ़ैक्टर) जमा किए जा रहे हैं कि आइन्दा जब ठहराव का चरण आए तो वह सही माइनों में ठहराव और स्थायित्व बन सके।

इस अमल के दौरान ईश्वर के पैग़ाम के तमाम पहलू पूरी तरह खुल जाएं। सच्चे इन्सान और झूठे इन्सान एक-दूसरे से अलग कर दिए जाएं। यह मालूम हो जाए

कि कौन सही माइनों में हक़ को चाहने वाला है और वह कौन है जो हक़ का नाम सिर्फ़ इसलिए लेता है कि उसकी आड़ में अपना निजी फ़ायदा हासिल कर सके। गुमनामी में पड़े हुए हीरे निखर उठें और झूठी शोहरत का लबादा ओढ़ने वाले लोग बेनक़ाब हो जाएं।

और यह कि जब रसूलुल्लाह (स.अ.व.) और आपका चिन्तन माहौल में छा जाए तो इस तरह छाए कि वह उनका एक साबितशुदा हक़ बन चुका हो, और इसी तरह जब आपके विरोधियों को नाकाम किया जाए तो यह नाकामी इस तरह आए कि वह लोगों को एक खुली हुई ऐतिहासिक ज़रूरत दिखाई देने लगे।

मुश्किल में आसानी का यह तजुर्बा जो रसूलुल्लाह (स.अ.व.) को हुआ, यही आइन्दा भी आपके उम्मतियों को होता रहेगा, बशर्ते कि वे उसी सही रास्ते पर चलें, जिस पर आप चले और उसी सब्र और धीरज का सबूत दें जिसका सबूत आपने अपने ज़माने में दिया।

अल्लाह की याद तमाम आमाल का ख़ुलासा है

हज़रत अबूदर्दा' से रिवायत है कि नबी सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने फ़रमायाः क्या मैं तुमको न बताऊं कि कौन सा अमल (कर्म) सबसे बेहतर है, और तुम्हारे आक़ा के नज़दीक सबसे पाकीज़ा (पवित्र) है और तुम्हारे दर्जे को बढ़ाने वाला है और तुम्हारे लिए सोने-चांदी के इन्फ़ाक़ (बहुलता, प्रचुरता) से बेहतर है और तुम्हारे लिए इससे बहेतर है कि तुम अपने दुश्मन से मुठभेड़ करो और तुम उनकी गर्दनें मारो और वे तुम्हारी गर्दनें मारें? सहाबा ने कहा, हां ऐ ख़ुदा के रसूल। आपने फ़रमायाः अल्लाह तआला को याद करना। (सुनन अल-तिर्मिज़ी, हदीस संख्या 3377)

लायक़ और सालेह आदमी हर चीज़ से ज़्यादा क़ीमती

बुख़ारी ने तारीख़े-सग़ीर में यह वाक़िआ नक़्ल किया है। ज़ैद बिन असलम अपने बाप के हवाले से बताते हैं कि उमर बिन ख़त्ताब रज़ी अल्लाहु अन्हु ने अपने असहाब से कहाः तुम लोग अपनी तमन्नाएं बताओ। किसी ने कहा कि मेरी तमन्ना यह है कि मेरा घर दिरहम से भरा होता तो मैं उसको अल्लाह के रास्ते में ख़र्च करता। किसी ने कहाः मेरे पास इस घर के बराबर सोना होता तो मैं उसको अल्लाह के रास्ते में दे देता। किसी ने कहा मेरी तमन्ना है कि यह घर मोतियों से भरा होता और मैं उसको अल्लाह के रास्ते में ख़र्च करता। वग़ैरह उमर रज़ीअल्लाहु अन्हु ने फ़रमायाः लेकिन मेरी तमन्ना तो यह है कि इस घर भर मेरे पास अबू उबैदा बिन अल-जर्राह, मुआज़ बिन जबल और हुज़ैफ़ा बिन यमान जैसे लोग होते और उनको मैं अल्लाह के कामों में इस्तेमाल करता। (अल-तारीख़ अल-सग़ीर, भाग 1, पेज 54)

कमाने वाला अपने को बड़ा न समझे

अनस रज़ी अल्लाहु अन्हु कहते हैं कि रसूलुल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम के ज़माने में दो भाई थे। एक भाई रसूलुल्लाह (स.अ.व.) के पास आया करता था और दूसरा भाई घर के लिए कमाई करता था। कमाई करने वाले ने रसूलुल्लाह (स.अ.व.) से अपने भाई की शिकायत की (कि वह काम नहीं करता, मुझको अकेले ही दोनों के लिए कमाना पड़ता है) आपने फ़रमाया, "शायद तुमको रोज़ी उसी की वजह से मिलती हो।" (सुनन अल-तिर्मिज़ी, हदीस संख्या 2345)

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

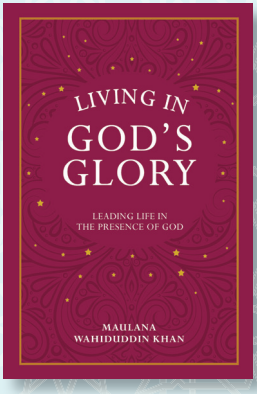

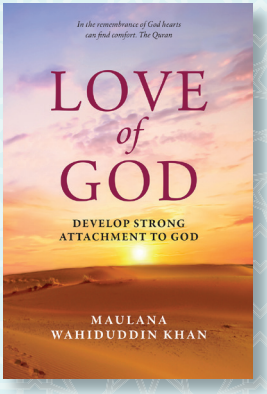

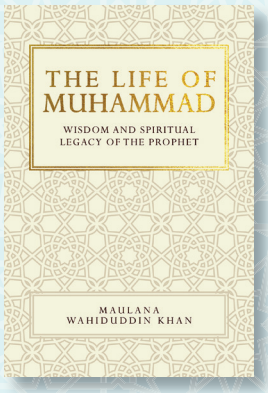

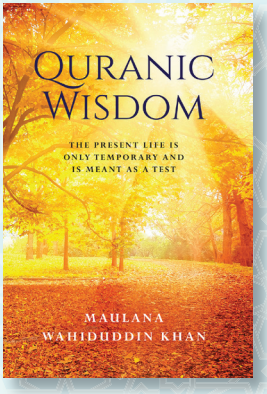

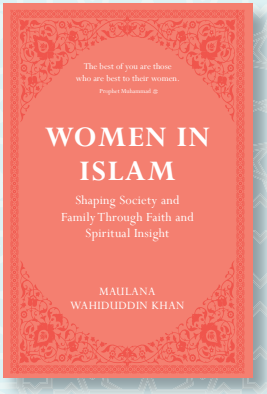

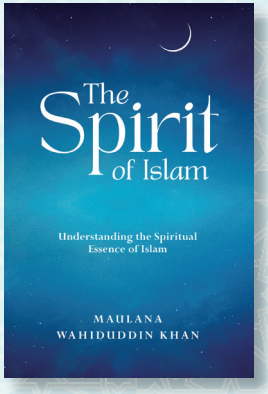

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23